پاکستان کا مستقبل

سٹیفن پی۔ کوہن

ترجمہ: محمد اختر

مشعل

MashalBooks.org

پاکستان کا مستقبل

مصنف :سٹیفن پی کوہن

ترجمہ: محمد اختر

مشعل بکس

آر بی۔ ۵، سکینڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

۵۴۶۰۰ پاکستان

MashalBooks.org

پاکستان کا مستقبل

سٹیفن پی۔کوہن

اردو ترجمہ: محمد اختر

کاپی رائٹ اردو 2011(c) مشعل بکس
کاپی رائٹ انگریزی 2010(c) سٹیفن پی۔کوہن

ناشر: مشعل بکس
آر۔ بی۔ ۵۔ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک،
نیو گارڈن ٹاؤن لاہور 54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

فہرست

مصنف کے بارے میں	4
دیباچہ	5
تعارف	6
پاکستان 2011ء تک	11
مشرف : ایک اور ناکام جرنیل	14
آصف علی زرداری	20
2010ء تک کے رجحانات	25
متوسط طبقے یا مڈل کلاس کا قصہ	37
منظر نامہ اور نتائج	83
حاصل بحث	95
خطرے کے چھ اشارے	97
پالیسی : امید اور مایوسی کے درمیان	100
ضمیمہ	106
حواشی	120

MashalBooks.org

مصنف کے بارے میں

سٹیفن پی کوہن بروکنگز میں خارجہ پالیسی کے حوالے سے سینئر فیلو ہیں۔ وہ یونیورسٹی آف الی نوائے میں سیاسیات اور تاریخ میں پروفیسر کے طویل کیریئر کے بعد1998ء میں بروکنگز آئے۔وہ اس سے پہلے فورڈ فاؤنڈیشن نئی دہلی میں سکالر ان ریزیڈنس اور امریکی محکمہ خارجہ میں پالیسی پلاننگ کے رکن کے طور پر بھی کام کرچکے ہیں۔وہ بھارت، جاپان اور سنگاپور کی یونیورسٹیوں میں بھی پڑھاچکے ہیں۔وہ اس وقت نیشنل اکیڈمی آف سائنس کی کمیٹی برائے انٹرنیشنل سیکورٹی اینڈ آرمز کنٹرول کے رکن ہیں۔ڈاکٹر کوہن جنوبی ایشیائی سیکورٹی کے معاملات کے بارے میں گیارہ سے زائد کتب کے مصنف اور ایڈیٹر بھی ہیں۔ان کی سب سے حالیہ کتاب ''آرمنگ ود آؤٹ ایمنگ : انڈیا ماڈرنائزز اٹس ملٹری'' ہے جس کے شریک مصنف سنیل داس گپتا ہیں اور جس کا موضوع بھارتی فوج کی توسیع ہے۔ڈاکٹر کوہن یونیورسٹی آف شکاگو سے بیچلر اور ماسٹری ڈگری کے حامل اور یونیورسٹی آف وسکونسن سے پی ایچ ڈی ہیں۔

MashalBooks.org

دیباچہ

یہ اس وسیع تر منصوبے کا مرکزی مضمون ہے جس کا مقصد پاکستان کے وسط مدتی مستقبل کا جائزہ لینا ہے جو کہ اگلے پانچ سے سات سال (2012-201۷) تک محیط ہے۔منصوبے کے دیگر عوامل میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سابقہ پیش گوئیوں کا ایک خلاصہ اور مئی 2010ء میں بیلاجیو اٹلی میں واقع راک فیلر کانفرنس سنٹر میں ایک ورکشاپ کے لیے جمع کرائے گئے چودہ مضامین ہیں۔ مصنفین سے کہا گیا کہ وہ چار ایسے عوامل کے بارے میں مختصراً بیان کریں جو کہ پاکستان کے مستقبل کی تشکیل میں کردار ادا کریں اور ان کے ممکنہ نتائج کے بارے میں کوئی قیاس کریں یہ مضمون اسی نمونے کے مطابق آگے بڑھتا ہے۔حالیہ واقعات کے ایک مختصر خلاصے کے بعد یہ کئی عوامل کا تجزیہ کرتا ہے جن کو چار درجات میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر کئی متبادل مستقبلیاتی منظر نامے سامنے لاتا ہے۔ یہ اس مشق سے جنم لینے والے طریقیاتی مسائل کا جائزہ لیتا ہے اور پالیسی آپشن بالخصوص امریکہ، مغربی ممالک، جاپان اور بھارت پر بحث کرتا ہے۔

بروکنگز اس منصوبے کی اعانت کے لیے راک فیلر فاؤنڈیشن، کارنیگی کارپوریشن، یونائیٹڈ سٹیٹس انسٹی ٹیوٹس آف پیس اور نارویجین پیس بلڈنگ فاؤنڈیشن کا شکرگذار ہے۔اس مضمون کے حتمی سیکشن کے کچھ حصے پہلے نارویجین پیس بلڈنگ فاؤنڈیشن (نوریف) میں پالیسی بریف کے طور پر سامنے آ چکے ہیں۔ میں پاکستان کے نوجوان اور ابھرتے ہوئے سکالرز عظیمہ چیمہ اور ارم حیدر کا بھی اس منصوبے میں ان کی اعانت پر شکرگذار ہوں جن کی بصیرت قابل قدر ہے۔کانسٹنٹینو ژاوئیر کا بھی شکریہ جنھوں نے اس مضمون کی حتمی طور پر تیاری کے لیے بروقت مدد فراہم کی اور یوایس آئی پی میں ورکشاپ کے انعقاد میں بھی مدد کی جہاں بڑی تعداد میں موجود شرکاء کے روبرو ہماری تحقیق کے نتائج پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

سٹیفن پی کوہن

MashalBooks.org

تعارف

کم ازکم چھ وجوہات کے باعث پاکستان کا مستقبل اس کے پڑوسیوں سے لیکر قریب و دور کے کئی ممالک کے لیے اہمیت کا حامل ہے:

☆ پاکستان ایک ایٹمی ملک ہے جس کا ایٹمی پھیلاؤ کے حوالے سے ریکارڈ بہت خراب ہے۔

☆ پاکستان اپنی ریاستی پالیسی کے طور پر ہمسایہ ملکوں میں جہادیوں اور عسکریت پسندوں کی سرگرمی کے ساتھ مدد کرتا ہے اور یورپ یہاں تک کہ دوست ملک چین میں سرگرم عسکریت پسندوں کے حوالے سے بھی اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے یا پھران کی مخالفت کے حوالے سے بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔

☆ بھارت کے ساتھ اس کا تشخص کے حوالے سے تنازعہ جاری ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ آئندہ چند سالوں کے دوران دونوں ملکوں کے درمیان نئے بحران جنم لیں گے۔

☆ پاکستان کی معیشت کی حالت خراب ہے اور 2005ء کے زلزلے اور 2010ء کے سیلاب کے نتیجے میں ہونے والی تباہی کے باعث اور بھی بدتر ہوچکی ہے۔

☆ پاکستان کے آبادیاتی اشاریے خراب دکھائی دیتے ہیں اور بدتر معاشی حالت کے باعث اور بھی بگڑ رہے ہیں۔وہ وقت بیت گیا جب یہ ملک مڈل انکم سٹیٹس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

☆ پاکستان جنوب، جنوب مغرب اور وسطی ایشیاء کے لیے ایک بڑی پریشانی بن سکتا ہے اور بھارت کے پرامن طریقے سے ابھرنے کے عمل کو برباد کرنے کے علاوہ خلیج فارس

MashalBooks.org

اور وسط ایشیائی خطوں کے عدم استحکام کی وجہ بن سکتا ہے۔

زوال پذیر سماجی اشاریوں، گرتے ہوئے انفراسٹرکچر اور فوج کی غلط ترجیحات کے باعث پاکستان گہری مشکلات میں گھر چکا ہے اور اگر خوش قسمتی سے یہاں پر بڑی تعداد میں باصلاحیت پاکستانی نہ ہوتے تو کوئی بھی پاکستان کو ایک ایسی ریاست قرار دینے میں تامل نہیں کرتا جو تیزی سے شدید زوال کی حالت میں ہو۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ پاکستانی ریاست کمزور ہوچکی ہے لیکن پاکستانی معاشرہ بہت باصلاحیت اور باہمت ہے اور صوبائی ثقافت اور باصلاحیت اشرافیہ کی صورت میں اس کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے تاہم یہاں پر آرزوؤں اور حقیقی کارکردگی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔

پاکستان کے مستقبل کا جائزہ پیش کرنے والے سابق منصوبے محتاط انداز میں امید افزاء تھے اگرچہ کچھ ماہرین نے فیصلہ کن انداز میں مایوسی کا مظاہرہ کیا تھا۔ضمیمہ میں اس بارے میں ایک رپورٹ شامل کی گئی ہے۔

یہ مضمون ''دی آئیڈیا آف پاکستان'' کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے جس میں ایک پورا باب اس کے مستقبل کے بارے میں ہے۔ مجھے اس کتاب کا آخری جملہ لکھنے میں پورا ایک ہفتہ لگ گیا تھا کیونکہ مجھے اس کے لیے صحیح زبان تک پہنچنے میں بہت مشکل محسوس ہوئی تھی۔ میں نے لکھا تھا:

پاکستان کو مایوسی کی حد تک ایک ناکام ریاست قرار دینے سے پہلے، جیسا کہ اس کے نقاد سمجھتے ہیں،امریکہ کے لیے آخری موقع ہوگا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ مشکلات میں گھری یہ ریاست خارجہ پالیسی کے ضمن میں اس عشرے کے آخری نصف تک امریکہ کے لیے سب سے بڑی مشکل نہ بن جائے۔

2006ء میں جبکہ پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف امن کا نوبل انعام حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اس وقت بھی تشویش کے عوامل صاف دکھائی دے رہے تھے۔اس بات کے واضح شواہد تھے کہ پاکستان ایک فیصلہ کن موڑ لے رہا ہے اور یہ کہ ایک اعتدال پسند، سیکولر اور قابل قبول ریاست کا حقیقی نظریہ رسائی سے باہر تھا اور یہ کہ کسی اور ہی قسم کا پاکستان ابھرتا دکھائی دیتا تھا۔ جناح کے اعتدال پسند پاکستان کے خواب سے مکمل طور پر مایوس نہ بھی ہوا جائے تو بھی اب اس کا امکان دکھائی نہیں دیتا۔

کچھ پاکستانی اب اپنے ملک کے حوالے سے شدید مایوس دکھائی دیتے ہیں۔حتیٰ کہ ایک سابق آرمی چیف جو کہ جنرل ضیاء الحق کا قریبی ساتھی رہ چکا تھا وہ پاکستان کے بارے میں جو لکھتا ہے اس سے پاکستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی ایک واضح تصویر سامنے آتی ہے:

پاکستان ایک زخم خوردہ قوم ہے جسے اس کے دوستوں اور دشمنوں دونوں نے زخمی کیا ہے۔اس کا قومی جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے جو اسے اس کے آمروں اور جمہوریت پسندوں، ججوں اور جرنیلوں، بیوروکریٹس اور میڈیا نے لگائے ہیں۔کوئی بھی اس الزام سے مبرا نہیں۔

''آئیڈیا آف پاکستان'' میں متبادل مستقبل پر تبادلہ خیال ہے۔جس میں ایک تو یہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ کا غلبہ جاری رہے گا(ایک ایسی ریاست جہاں اگر جمہوریت نہیں تو جمہوری اقدار کو برقرار رکھا جائے گا) اور ایک ایسی ریاست ہوگی جس کے افغانستان اور بھارت سے اگر اچھے نہیں تو مستحکم تعلقات ہوں گے۔پاکستان کے جو دیگر مستقبلیاتی منظر نامے ہوسکتے ہیں ان میں کھلم کھلا طور پر فوج کی حکمرانی ہوگی یا ایک مکمل طور پر اسلامی ریاست ابھرے گی یا ایک بھرپور جمہوریت ہوگی۔اس کے علاوہ ایک ایسے پاکستان کے امکانات کا جائزہ لیا گیا جس میں جنوب مغربی سرحدی صوبہ (اب خیبر پختونخواہ)، سندھ، بلوچستان اور مہاجر غلبے کے حامل سندھ اور کراچی کے علاقے پنجاب سے الگ ہوجائیں گے۔آخر میں خود پنجاب کے ٹوٹنے اور بھارت کے ساتھ ایک نئی اور بڑی جنگ کے امکانات پر بھی بحث کی گئی۔

ممکنہ تناسبات جو کہ ان نتائج سے منسلک کیے جاسکتے ہیں تو یہ سو فیصد تک ہوجائیں گے کیونکہ کچھ مستقبلیاتی منظر نامے ایک ساتھ یا یکے بعد دیگرے ابھر سکتے ہیں۔ان منظر ناموں کا کوئی خصوصی ٹائم فریم نہیں اور اس منصوبے میں شامل شرکاء کی اکثریت کا ماننا ہے کہ چند سال تک انتہائی نوعیت کے واقعات کا رونما ہونا خارج از امکان ہوسکتا ہے۔

پاکستان کی صورت حال کے حوالے سے بے یقینی قائم ہے اور پاکستان کی ریاست اور معاشرہ آج پہلے سے بھی زیادہ لاعلم ہے جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان میں فرسٹ ہینڈ ریسرچ اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے جتنی کہ چند سال پہلے تک تھی۔

اس مضمون کا ایک حصہ ان چودہ مضامین پر مشتمل ہے جنہیں پاکستان کے امور کے

بارے میں ماہرین نے تحریر کیا ہے۔ یہ ماہرین یورپی، امریکی اور پاکستانی جبکہ ان میں سے ایک بھارتی بھی ہے۔ان سے کہا گیا کہ وہ پاکستان کے بارے میں ان عوامل کی شناخت کریں اوران پر بحث کریں جو کہ پاکستان کے مستقبل کی تشکیل میں اہم ہیں اور پھر امکانی ترین منظر نامے پیش کریں۔اس اپروچ کا انتخاب شعبہ جاتی تجزیات (جیسے معیشت، پارٹی سسٹم اور فوج) کے انتخاب سے لیکر مستقبل کے ممکنہ منظرناموں کوسامنے لانے کی حوصلہ افزائی کی بنیاد پر کیا گیا۔انہوں نے جو جواب دیے ان میں خاصا تنوع تھا اورمتعدد شرکاء نے ایک ہی قسم کی چیزوں اور عوامل کومختلف انداز میں اجاگر کیا جو کہ بذات خود معلوماتی تھا۔کچھ شرکاء کومخصوص موضوع، مسئلے یا عامل پر فوکس کرنے کو کہا گیا۔لہٰذا دستاویزات مکمل طور پر قابل موازنہ نہیں۔

میں نے رجحانات اور پیش گوئیوں کے ساتھ کسی قسم کے نمبر منسلک کرنے سے گریز کیا۔تاہم زبان اور لب و لہجے سے یہ طور پر بتانا چاہیے کہ موجودہ اسٹیبلشمنٹ کے زیر غلبہ ریاست پر مشتمل مستقبلیاتی نقشے کا سب سے زیادہ امکان ہے یا زیادہ ''کوزے میں دریا بند '' کرنا ہوتو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کئی قسم کے بدترین قسم کے حالات جنم لے سکتے ہیں اور اس بات کا امکان غالب ہوسکتا ہے کہ مستقبل زیادہ انتہاپسند اور ناخوشگوار ہوگا۔

میں اس حوالے سے پراعتماد نہیں کہ امریکہ کے پاس پاکستان کو راہ پر لانے کے لیے ''ایک آخری موقع'' ہے تاہم2003ء میں اگر یہ کہا بھی جاتا تو اس میں' شاید' کا اضافہ کرکے ہی اسے کسی قدر جواز دیا جاسکتا تھا۔تاہم اس تجزیے کے پالیسی مضمرات واضح ہیں :ناکامی کے کیا نتائج ہوں گے ہم اس کے بارے میں اس سے زیادہ جانتے ہیں کہ آیا ''ایک آخری موقع'' جیسی کوئی صورت حال پیدا ہوگی۔لہٰذا اچھے کی امید کے ساتھ کوشش کرنا بہت ضروری ہے۔ناکامی کوئی آپشن نہیں۔چاہے یہ پاکستانیوں اور بیرونی طاقتوں کی تمام کوششوں کے باوجود وقوع پذیر ہوجائے۔عمومی طور پر جوسوال پوچھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کدھر جارہا ہے جبکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا پاکستان کہیں جا بھی رہا ہے:موجودہ بدامنی اور بے چینی سے کس قسم کا پاکستان ابھرے گا۔حالیہ واقعات بالخصوص سلمان تاثیر کے قتل سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ پاکستان ایک مربوط اور بامقصد ریاست کے طور پر زوال کی طرف گامزن ہے۔

MashalBooks.org

میں ذاتی طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ میں1964ء سے پاکستان کا مطالعہ اور1978ء سے اس کا باقاعدہ دورہ کرتا رہا ہوں لیکن میں وہاں ایک وقت میں کبھی ایک ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ یہ مضمون مئی2010ء میں ایک ڈرافٹ کی صورت میں لکھا گیا لیکن پھر ستمبر اور اکتوبر 2010ء میں پاکستان اور بھارت کے ایک طویل دورے کے بعد اس پر خاطرخواہ نظرثانی کی گئی۔لہٰذا معاشرے اور کلچر کے حوالے سے میرا تاثر محدود ہے تاہم مجھے امید ہے کہ یہ خاصا درست ہے کم ازکم ان فوری ماہرین کے مقابلے میں جو گذشتہ چار پانچ سال کے دوران پاکستان کے بارے میں خاصا کچھ لکھ چکے ہیں۔میرا زیادہ تر انحصار پاکستانی دوستوں اور ساتھیوں پر رہا تاہم یہ لوگ بھی پاکستان میں جاری حالیہ رجحانات اور تبدیلیوں کے بارے میں کوئی تسلی بخش وضاحت کرنے میں مشکل پاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس سٹڈی سے کوئی ناراض نہیں ہوگا اور اس سلسلے میں میں آرتھر کوئسلر کا مقولہ پیش کروں گا کہ اگر طویل مدتی فائدے کے طور پر دیکھا جائے تو کڑوا سچ میٹھے جھوٹ سے بہتر ہوتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہاں پر بہت سے جھوٹ پھیلے ہوئے ہیں چاہے انہیں امریکیوں نے پھیلایا ہو یا پاکستانیوں و دیگر نے، اور اب وقت آ گیا ہے کہ کڑوے سچ کا سامنا کیا جائے۔

پاکستان 2011 تک

پاکستان موجودہ حالت تک کیسے پہنچا ؟ پاکستان کو وجود میں لانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انگریز دور کے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک قائم کیا جائے جہاں وہ ہندوؤں کے جبر کے بغیر محفوظ زندگی گذار سکیں۔ کچھ لوگوں کے لیے تو یہ ٹھیک تھا تاہم یہ تعداد برصغیر کے تمام مسلمانوں کے نصف سے بھی کم تھی اور امر حیرت یہ تھا کہ شمالی ہندوستان کے متوسط طبقے کے مسلمانوں جنہوں نے تحریک پاکستان کی قیادت کی تھی بعد میں وہ انہی لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے جن میں کسی نئی ریاست کے قیام کے حوالے سے بہت کم جوش تھا۔ کچھ لوگ تو خصوصی طور پر کسی اسلامی ریاست کے قیام کے ہی مخالف تھی۔

قیام پاکستان کے ایک عشرے بعد ہی فیلڈ مارشل ایوب خان جو بعد میں صدر بن گیا اس نے پاکستان کے پہلے اصلاحاتی پروگرام کا آغاز کیا۔ نظم وضبط، گائیڈڈ جمہوریت اور مارکیٹ اکانومی (جس میں فلاح وبہبود اور تعلیم کے بہت کم موثر سرمایہ کاری تھی) نے تیز معاشی گروتھ کے لیے ایک فریم ورک فراہم کیا اوراس سے سیاسی استحکام نے بھی جنم لیا۔ ایوب خان کو ان تجربات میں بعض رکاوٹوں کا بھی سامنا رہا جن میں سے ایک بھارت کے ساتھ 1965ء میں ہونے والی ناکام جنگ بھی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان نے لے لی جو بڑھتی ہوئی بے چینی پر قابو نہ پاسکا۔ مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوگئی اور 1971ء میں بھارت کی مدد سے وہ پاکستان سے الگ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔

پاکستان میں اصلاحات کا اگلا مرحلہ مختصر رہا۔ اس کی قیادت کرشماتی لیڈر ذولفقار علی بھٹو کے پاس تھی جس نے بیک وقت پاکستانی فوج پر کنٹرول حاصل کرنے، خارجہ پالیسی اور

سکیورٹی پالیسی میں تنوع لانے،ایٹمی ہتھیار تیار کرنے اور اسلام اور سوشلزم کی بنیاد پر ایک معاشی سسٹم لانے کی کوشش کی۔بھٹو کو ایوب اور یحییٰ سے بھی زیادہ شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے ایک متنازعہ مقدمے میں پھانسی دے دی گئی جس کی منصوبہ بندی جنرل ضیاء الحق نے کی تھی۔ضیاء الحق نے اسلام کا نعرہ بلند کیا۔امریکی سرپرستوں اور ساتھ ہی چین اور سعودی عرب کی مدد سے اس نے تیسرا اصلاحاتی پروگرام شروع کیا اور اسلامائزیشن اور ایٹمی ہتھیاروں کی طرف توجہ دی۔اس نے پاکستان کے سویلین اداروں بالخصوص عدالتوں کو مزید نقصان پہنچایا۔ ضیاء الحق اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں زیادہ زیرک تھا تاہم وہ مذہبی جنونی بھی تھا لیکن افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کو نکالنے کے لیے مجاہدین کی مدد کے حوالے سے اسے غیر ملکی حمایت بھی حاصل تھی۔

ضیاء الحق کی موت کے بعد1989 سے1999 کے درمیان بینظیر بھٹو اور نواز شریف باری باری حکومتوں میں رہے جو ایک ایسا عشرہ تھا جس میں جمہوریت کی حالت ٹھیک نہ تھی ۔ درحقیقت نوے کے عشرے کو''گمشدہ عشرہ'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس کی وجہ اس دور میں معاشی گروتھ بہت کم تھی اور دیہاتوں اور شہروں میں غربت میں بہت اضافہ ہوا تھا۔اسی کے عشرے میں جہاں گروتھ کی شرح 6.5 فیصد تھی تاہم نوے کے عشرے میں رئیل جی ڈی پی گروتھ کم ہوکر 4.6 ہوگئی تھی۔

بے نظیر اور نواز شریف فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں، جو کہ ضیاء الحق کے دور میں مقامی سیاست میں بہت دخیل ہوچکی تھیں،کی مداخلت کے بغیر حکومت کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔فوج کا خیال تھا کہ وہ روح پاکستان کی اصل محافظ ہے اور وہ بھارت سے درپیش خطرات اور بیرونی طاقتوں بالخصوص امریکہ،سعودی عرب اور چین کی حمایت حاصل کرنے کے معاملے کو سیاستدانوں سے زیادہ بہتر انداز میں جانتی ہے۔نوے کی دہائی جسے جمہوریت کا عشرہ بھی کہتے ہیں اس میں بینظیر اور نواز شریف کل چار مرتبہ وزیراعظم رہے۔اس دور میں پریس حکومتی سنسرشپ سے آزاد تھی جس کا کریڈٹ بے نظیر کو جاتا تھا اور اکانومی کو لبرلائز کرنے کے حوالے سے جو اقدامات کیے جارہے تھے ان کا کریڈٹ نواز شریف کو ملتا تھا تاہم یہ دونوں حکمران بڑھتی ہوئی اسلامی تحریکوں پر قابو پانے میں ناکام رہے اور نہ ہی اس ریاستی نظام کی مرمت کرسکے جو گذشتہ تیس سال کے دوران بہت کمزور ہوچکا تھا،نہ ہی

دونوں فوج سے سول اختیارات واپس لینے میں کامیاب ہو سکے جو کہ ان دنوں پاکستانی الیکشن میں فکسنگ کے حوالے سے بہت پیچیدہ نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ بے نظیر نے تعلیم میں سرمایہ کاری کی تاہم ریاست ان کی پالیسیوں کے نفاذ میں ناکام رہی جبکہ گھوسٹ سکولوں کا پتہ چلانے کے لیے نواز حکومت کو فوج کی مدد لینا پڑی۔ گھوسٹ کمپیوٹرز کا ایک مسئلہ بھی سامنے آیا جو کہ سکولوں اور دیہاتوں میں بڑے پیمانے پر کمپیوٹر تقسیم کرنے کا منصوبہ تھا اور جن کا بے نظیر متعدد بار تذکرہ بھی کر چکی تھیں ......اگرچہ یہ محض کاغذوں میں تھا۔

MashalBooks.org

مشرف : ایک اور ناکام جرنیل

جنرل مشرف نے1999ء میں ایک پرامن بغاوت کے نتیجے میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد پاکستان میں اصلاحات کا چوتھا دور شروع کیا۔مشرف نے کشمیر کے کارگل ریجن کے راستے بھارت پر سیاسی اور فوجی سطح پر حملہ کرنے کا مہلک فیصلہ کیا اور پھر اس ناکامی کا الزام نوازشریف پر عائد کردیا۔اس نے دیکھا کہ سیاستدانوں نے اپنی باری لے لی ہے اور دس سال کی ناکام جمہوریت میں وہ پاکستان کی معیشت کو بہتر نہیں بنا سکے اور نہ ہی ملک کی سماجی اور سیاسی صورت حال میں کوئی بہتری لا سکے ہیں۔مشرف جو ابھی تازہ دم تھے انہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ اس مرتبہ ملک کے کرپٹ اور نااہل سیاستدانوں اور افسر شاہی کو درست کردیں گے اور آرمی کی مدد سے پاکستان کو درست راستے پر لے آئیں گے۔انہوں نے اس تجویز کو مسترد کردیا تھا کہ کرپٹ یا نااہل سیاستدانوں کو ہٹا دیا جائے اور یہ کہ نئے الیکشن کرائے جائیں اور نوجوان اور اہل سیاستدانوں کی نئی کھیپ سامنے لائی جائے (میرا کہنا یہ تھا کہ جمہوریت کے قیام میں وقت لگے گا اور سیاستدانوں کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ غلطیاں کریں اور ان سے سبق سیکھیں)۔مشرف ان میں سے کوئی بات ماننے پر تیار نہ تھے اور وہ اس حوالے سے پراعتماد تھے کہ فوج کی مدد کے ساتھ وہ پاکستانی ریاست اور قوم کے لیے اصلاحات کی ایک اور مہم شروع کرسکتے ہیں۔ان کی اندرونی اصلاحات کی ایک جھلک ذیل میں پیش خدمت ہے:

☆ مالی اور انتظامی اختیارات کی اضلاع کو منتقلی،اس سے صوبوں کے اختیارات میں مزید

MashalBooks.org

کمی ہوگئی اور اس نظام کو بعد میں ترک کر دیا گیا۔

☆ ریاستی اثاثوں کی نجکاری، اس کے نتیجے میں ملکی خزانے میں بھاری اضافہ دیکھنے میں آیا۔
☆ غربت کم کرنے کی حکمت عملی میں بہتری
☆ قومی احتساب بیورو کا قیام، یہ نہایت متنازعہ معاملہ تھا اور ایک موقع تو ایسا آیا کہ اسے بند کر دیا گیا۔
☆ ریاستی سرکاری میڈیا کی اجارہ داری کا خاتمہ اور آزاد میڈیا کی حوصلہ افزائی، تاہم اپنے اقتدار کے آخری ایام میں مشرف نے ایمرجنسی کا نفاذ کیا اور پریس کی آزادی کو محدود کیا۔
☆ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے اختیارات میں اضافہ اور نئی یونیورسٹیوں کا قیام۔
☆ پارلیمنٹ میں خواتین کے لیے مخصوص نشستیں۔
☆ حدود قوانین میں اصلاحات کے لیے ویمن پروٹیکشن بل پر دستخط
☆ انسداد دہشت گردی کے لیے اقدامات، فرقہ وارانہ تشدد کے خلاف سخت موقف تاہم عملی طور پر اس حوالے سے پالیسیاں غیر موثر رہیں۔
☆ مدرسوں کی رجسٹریشن اور نئے نصاب کی تیاری، اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

مشرف نے رہنمائی کے لیے ٹیکنو کریٹس سے رجوع کیا۔مقامی حکومتوں کے نظام کو تبدیل کیا اور بہت سے ریاستی اثاثوں کو فروخت کیا (اس طرح ادائیگیوں میں توازن کا مسئلہ بہتر ہوا جو کہ ایک ایسے ملک کے لیے ہمیشہ شدید ہوتا ہے جہاں غیر ملکی سرمایہ کاری کم ہو اور مینوفیکچرنگ کی صلاحیت بھی ناپید ہو)۔اس کے بعد اس نے مزید اقدامات کیے اور 2000ء میں عدلیہ کو اپنے ماتحت لانے کے لیے نیا حلف لیا جس میں اس کے ساتھ وفاداری کی قسم اٹھائی گئی۔مشرف کی ایک اور کامیابی جس کا عوامی اور نجی سطح پر بہت ڈھنڈورا پیٹا گیا وہ شیعہ سنی ڈیتھ سکواڈ کے درمیان جاری قتل عام جو ''فرقہ وارانہ تشدد'' کہلاتا ہے، سے نمٹنے کے بارے میں تھا تاہم درحقیقت اس میں اضافہ ہی ہوا۔مزید یہ کہ بش انتظامیہ کے ساتھ گلوبل وار آن ٹیرر یعنی دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے معاہدے میں شرکت کے باوجود ان کی حکومت نے کبھی ان عسکریت پسند اور متشدد گروپوں کے خلاف امداد کو ختم نہ کیا

MashalBooks.org

جو افغانستان، کشمیر اور خود بھارت میں سرگرم تھے۔

جہاں تک بھارت کے ساتھ تعلقات کا تعلق ہے تو اس میں مشرف نے کچھ اہم تبدیلیاں کیں۔ یہ چیزیں اس وقت سے ہی مشرف کے دماغ میں تھیں جب وہ پہلی اقتدار میں آیا اور اسکے کئی سال بعد اس نے کشمیر پر اپنی تجاویز پیش کیں اور ایک خفیہ بیک چینل مذاکرات کا اہتمام کیا گیا۔ پاکستان میں میری جو بات چیت ہوئی اس میں دیگر جرنیلوں نے ان تجاویز کو کمزور قرار دیا تاہم وہ مشرف کے ساتھ چلنے کو تیار تھے تاکہ دیکھ سکیں کہ ان کے کوئی مثبت نتائج بھی برآمد ہوسکتے ہیں۔

اگرچہ مشرف پاکستان کے حوالے سے بہت مثالی قسم کا تصور رکھتا تھا تاہم وہ کوئی تزویراتی منصوبہ ساز نہیں تھا۔ اس نے نہ تو کسی قسم کی ترجیحات کا تعین کیا اور نہ ہی انسانی اور مادی وسائل کو اس طرح اکٹھا کیا کہ ان سے ایک کے بعد ایک کرکے منظم طریقے سے کام لیا جاسکے۔صدر کے طور پر بھی اس کا رویہ ایسا ہی رہا جیسے جنرل کے طور پر تھا۔وہ تعلقات بنانے میں تیز تھا لیکن جزئیات اور نفاذ کے سلسلے میں کمزور تھا۔اس کا سب سے اہم کام تب دیکھنے میں آیا جب اس نے چیزوں کو تنہا چھوڑا مثال کے طور پر الیکٹرانک میڈیا کو اس سطح پر آزادی دینا کہ آج پاکستان میں اسی سے زائد ٹی وی چینلز چل رہے ہیں گو کہ ان میں سے بہت سے پیشہ وارانہ معیار کے حامل نہیں۔دوسری جانب اس کی سب سے بڑی ناکامی۔۔۔ اور پاکستان کے لیے ایک سانحہ۔۔۔۔بے نظیر کی سیکورٹی کے حوالے سے لاپرواہی اور غفلت تھی اور اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں مشرف کو اس قتل میں جزوی طور پر ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس قتل کے نتیجے میں پاکستان اپنی سب سے باصلاحیت،اگرچہ ان میں کچھ خامیاں بھی تھیں،سیاست دان سے محروم ہوگیا اوراس طرح پاکستان کے لیے بہتری کے امکانات مزید کم ہوگئے۔

مشرف کی جانب سے غیرمقبول افغان جنگ میں ان کی حمایت اور عوامی رائے کے بارے میں غلط اندازوں، یہ سمجھنے کہ وہ وکیلو ں اور ججوں کے احتجاج کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے، کے نتیجے میں ان کی اقتدار پر گرفت کمزور ہونا شروع ہوگئی۔اقتدار پر تین سال تک قابض رہنے کے بعد وہ بھی اپنے پیش روجرنیلوں کی طرح سویلین سیاستدانوں سے اخلاقی حمایت کے خواہاں ہوگئے لیکن ایوب اور ضیاء کی طرح وہ بھی اپنے

MashalBooks.org

اقتدار کو جائز حیثیت دینے میں ناکام ہوگئے۔

مارچ2007ء میں مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو طلب کر کے استعفیٰ دینے کو کہا۔ جب انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو مشرف نے انہیں معطل کر دیا جو کہ پاکستانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا جس کے نتیجے میں واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو آخر خود مشرف کے زوال کا باعث بن گیا۔ چیف جسٹس کو سپریم کورٹ کی جانب سے جولائی میں بحال کر دیا گیا جس نے اس کے بعد مشرف کے الیکشنوں میں بطور قانونی امیدوار حصہ لینے کی اہلیت کے حوالے سے بحث شروع کر دی۔ مشرف نے نومبر2007ء میں ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا اور آئین اور سپریم کورٹ کے ججوں دونوں کو معطل کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مشرف مکمل طور پر تنہائی کا شکار ہوگئے کیونکہ وکلاء کے طبقے، سول سوسائٹی کی تنظیموں (لبرل اور قدامت پرست دونوں) اور آبادی کے سرگرم حصے نے اس فیصلے کی شدت سے مخالفت کی۔2008ء میں سماجی بے چینی، دنگے فساد اور حکومت مخالف اور وکلاء کے حمایتی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عوامی طاقت کے اس مظاہرے میں جو ہیرو کھل کر سامنے آیا وہ اعتزاز احسن کی صورت میں تھا جو پیپلز پارٹی کے سرگرم رہنما اور ایک ممتاز قانون دان تھے۔ اعتزاز احسن اب پی پی پی کے اندرونی حلقوں کا حصہ نہیں اور صدر زرداری سے دور ہیں اور کم سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ وکلاء کی تحریک میں پرو اسلامی جذبات بھی شامل تھے جنہوں نے اس عمل کے دوران اپنی عوامی اپیل میں اضافہ کیا اور امریکہ مخالف لہر کو آگے بڑھایا۔

امریکہ اور مغربی اہداف پر حملے تواتر سے ہونے لگے اور خود مشرف کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ نیویارک اور واشنگٹن میں نائن الیون کے حملے کے علاوہ ایک اور ٹرننگ پوائنٹ اس عشرے میں سامنے آیا جو خود پاکستان میں تھا۔ یہ لال مسجد کی شہادت کا واقعہ تھا جو کہ اسلام آباد کے قلب میں ایک مرکزی ہوٹل، سفارت خانوں اور آئی ایس آئی کے نئے ہیڈکوارٹر کے قریب واقع تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ لال مسجد پر مشرف حکومت کی جانب سے حملہ امریکہ نہیں بلکہ چین کے اشارے پر کیا گیا جسے پاکستانی اشرافیہ کے لوگ ملک کا سب سے قابل بھروسہ حامی سمجھتے ہیں۔ مغرب اور بھارت کی طرح چین بھی پاکستان میں بڑھتی ہوئی عسکریت پسندی اور عسکری ٹریننگ کیمپوں میں چینی مسلمانوں کی تربیت کے حوالے سے

سخت تحفظات رکھتا تھا۔چینی سفیر نے اسلام آباد میں چین کی خاتون کارکنوں کے اغوا کے واقعے پر اس کی سخت شکایت کی تھی۔مسجد کے عسکری گروپوں کے ساتھ قریبی تعلقات تھے جن میں سے کچھ کو تو آئی ایس آئی کی پشت پناہی حاصل تھی۔فوجی آپریشن کے نتیجے میں 102 افراد ہلاک ہوئے تاہم سرکاری میڈیا رپورٹس کے مطابق ہلاک ہونے کی تعداد لگ بھگ تین سو کے قریب تھی جن میں متعدد عورتیں اور کم عمر لڑکیاں بھی شامل تھیں۔اسلام آباد کے رہائشیوں کے مطابق علاقے میں گلتی سڑتی لاشوں کی بدبو تھی۔اس کے علاوہ اور بھی دہشت گرد حملے ہوئے اور پاکستان میں بار بار ڈرون حملوں کے باعث امریکہ اور مشرف کے خلاف عوامی رائے سخت ہوتی ہوگئی۔فوج عسکری گروپوں کی قیادت پر جوابی ضرب لگانے میں ناکام رہی جو کہ خیبر پختون خواہ کے قبائلی علاقے فاٹا،اسلام آباد اور پنجاب میں روپوش ہوجاتے تھے۔فوج کی شہرت داغدار ہوگئی اور2007ء میں مشرف کی جانب سے افسروں کوحکم دیا گیا کہ وہ چھاؤنی کے علاقے سے باہر جائیں تو وردی نہ پہنیں۔2009ء کے مقابلے میں2010ء میں منظّم تشدد بشمول خودکش حملوں کا کوئی واضح رجحان دیکھنے میں نہ آیا تاہم ان کی ہلاکت آفرینی میں اضافہ ہوگیا۔گذشتہ سال کے مقابلے میں2010ء میں دہشت گردی کے واقعات میں بڑے پیمانے پر کمی ہوئی اور کل 687 واقعات پیش آئے (2009ء میں ان کی تعداد1915 تھی) اور کل1051 اموات ہوئیں جبکہ گذشتہ سال میں یہ تعداد2670 تھی۔دسمبر2009 ء میں خودکش حملوں کے 80 واقعات کے مقابلے میں سمبر 2010ء میں خودکش حملوں کے 52 واقعات ہوئے تاہم ان کی ہلاکت آفرینی زیادہ تھی کیونکہ ان میں1224 اموات ہوئیں جبکہ گذشتہ سال دسمبر میں یہ1217 تھی۔

شکل نمبر ایک میں گذشتہ سالوں کے دوران خودکش حملوں کے رجحان کو ظاہر کیا گیا ہے۔تناسب میں کمی کے باوجود اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان دونوں پیمانوں میں افغانستان اور عراق کے بعد تیسرے نمبر پر آتا ہے۔خودکش دھماکے پاکستان میں نسبتاً ایک نئی آفت ہے۔2002 ء میں یہاں پر خودکش حملوں کے صرف دو واقعات پیش آئے۔2008ء میں یہ تعداد بڑھ کر 59 ہوگئی اور2009ء میں 84 پر جا پہنچی اور2010ء میں کم ہوکر 29 رہ گئی جو2005 ء کے بعد کم ترین تعداد تھی۔گذشتہ سال بدستور دنیا کے کسی بھی علاقے کے مقابلے میں خودکش حملوں سے سب سے زیادہ اموات پاکستان (556) میں ہوئیں جبکہ دنیا بھر میں

ہونے والے اس قسم کے دھماکوں کے ایک چوتھائی پاکستان میں ہوئے۔ سب سے زیادہ دھماکے اور اموات خیبر پختو خواہ کے پشتون علاقوں اور فاٹا میں ہوئیں جہاں پختون پختون کو مارتے رہے جبکہ نام نہاد پنجابی طالبان جیسے لشکر جھنگوی اور جیش محمد اور دیگر وغیرہ کا ہدف شعیہ، بریلوی، احمدی اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد رہے۔

ایک بھارتی مبصر کے مطابق خیبر پختون خواہ میں نہ تو پاکستانی فوج کے حملے اور امریکہ کے ڈرون حملے افغان اور پاکستانی پشتونوں کے جذبے کم کر پائے اور نہ ہی پنجابی طالبان کا کچھ بگاڑ پائے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں سے کچھ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے قریب ہیں۔

MashalBooks.org

20

آصف علی زرداری

بے نظیر بھٹو کے خاوند آصف علی زرداری ستمبر 2008ء میں پیپلز پارٹی اور دیگر سیکولر جماعتوں کی حمایت کے ساتھ ملک کے صدر منتخب ہوئے تاہم جنوری 2011ء میں یہ حمایت ختم ہوگئی۔مثال کے طور پر پنجاب میں نواز شریف کی مسلم لیگ(ن) اور پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت تھی۔ اگرچہ مخلوط حکومت کی یہ مثال ایک مجبوری کی وجہ سے قائم ہوئی تھی تاہم اس سے پاکستانی سیاستدانوں کو سبق ملا کہ جمہوری سیاسی نظام میں تعاون و اشتراک اور کھیل کے بعض قواعد کتنے اچھے ہوتے ہیں۔

زرداری سے توقعات بہت کم تھیں تاہم پیپلز پارٹی کے اہم ارکان کی مشاورت اور کراچی میں پیدا ہونے والے،سندھی بولنے اور پنجاب کے شہر ملتان سے تعلق رکھنے والے سیاستدان وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے ساتھ انہوں نے اپنے سے پہلے کی تمام سویلین حکومتوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی کارکردگی دکھائی جسے اگرچہ بہت عظیم کامیابی تو نہیں کہا جاسکتا تاہم نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

نئی حکومت کا ایجنڈا بھی وہی ہے جو زیادہ تر بے نظیر کا تھا۔یعنی تبدیلی کے بجائے اصلاحات اور بحالی، بے نظیر کے اہداف بہت بڑے تھے تاہم انہیں اپنی زندگی کے آخری

ایام میں اس بات کا پتہ چل چکا تھا کہ پاکستان کس قدر بری طرح چلایا گیا ملک ہے حتیٰ کہ ان کی اپنی طرف سے بھی، اور وہ اپنے ساتھیوں سے یہ کہتی رہیں کہ جس طرح بطور وزیراعظم ان کی پہلی حکومتی مدت کے مقابلے میں دوسری مدت کی حکومت زیادہ بہتر تھی اسی طرح اگر نئے سرے سے آغاز کیا جائے تو اس سے مزید زیادہ بہتری اور مقصدیت آئے گی۔تاہم پاکستان کو ایسے کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ جن افراد نے انہیں قتل کیا تھا انہیں بھی اس بات کا پتہ چل گیا کہ انہوں نے کیا کرڈالا۔ان کے پاس کرشماتی قوت تھی۔وہ بین الاقوامی سطح پر تعلقات رکھتی تھیں اور انہیں حکومت کا تجربہ حاصل تھا جو ان کی تمام تر خامیوں کے باوجود پاکستان کو کم ازکم نصف حد تک کامیاب ضرور کردیتا۔ان کی موت خاص طور پر جس طریقے سے انہیں قتل کیا گیا اس سے پاکستان کے تیس سال کے بحران کے بعد ایک نارمل ریاست کے طور پر ابھرنے کا امکان کم ہوگیا۔

آصف زرداری اپنی بیوی جیسی مہارت اور کرشمے سے محروم ہیں۔کرپٹ سیاستدان کے طور پر ان کی شہرت بینظیر کے سیاسی کیریئر کے لیے ایک بڑا مسئلہ رہی۔اپوزیشن اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی جانب سے انہیں ایک کرپٹ انسان کے طور پر پیش کرنے کی منظّم کوشش کی گئی۔زرداری کا اپنے دفاع میں کہنا ہے کہ ان پر کبھی بھی کوئی جرم ثابت نہیں ہوا اور یقینی طور پر پاکستان کے اکثر سیاستدانوں کے حوالے سے بھی یہ بات درست دکھائی دیتی ہے کہ خواہ کرپشن کے حوالے سے ان سیاست دانوں کی شہرت زرداری کے برابر یا ان سے بھی بڑھ کر ہے۔

ان کی صدارت کے دو سال کے دوران پاکستان کے آئین میں کئی اہم تبدیلیاں کی گئیں اور پاکستان کی ریاست کے کئی بری طرح کمزور ہوچکے اداروں کی دوبارہ بحالی کے لیے ایک کوشش کی گئی۔سول سوسائٹی طاقت ور ہورہی ہے۔ذرائع ابلاغ نئی آزادیوں سے لطف اندوز ہورہا ہے قطع نظر اس بات کہ 2010ء میں پاکستان کو صحافیوں کے لیے دنیا کا خطرناک ترین ملک ہونے کا ''اعزاز'' بھی حاصل رہا۔سماجی عدم مساوات، تعلیم اور گورننس کے حوالے سے بڑھتے ہوئے تحفظات کے نتیجے میں ہرقسم کی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کی تعداد میں اضافہ ہوا جن میں جدید اور اسلامی دونوں قسم کی این جی اوز شامل ہیں۔

پاکستان کے لوگوں اور حکومت کے درمیان ایک وسیع خلیج بدستور موجود ہے۔سوائے

جماعت اسلامی کے کسی پارٹی میں جمہوریت نہیں۔ پاکستان کے سیاسی نظام کے حوالے سے گہرا عدم اعتماد بدستور موجود ہے اور سلامتی کے حوالے سے خطرات بھی موجود ہیں۔ سویلین حکومت تاحال اپنا انحصار فوج پر رکھتی ہے خاص طور پر اس وقت جب ملک میں اندرونی سلامتی کی صورت حال خراب ہورہی ہو۔ پاکستان کے غیرملکی دوستوں پر بھی زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

وزیراعظیم یوسف رضا گیلانی کی شراکت سے زرداری کو جو اہم کامیابیاں نصیب ہوئیں وہ درج ذیل ہیں:

چیف جسٹس اور معزول ججوں کی بحالی:

چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور ان تمام ججوں جن کو پہلے مشرف کی طرف سے معزول کیا گیا ان کو زرداری کی جانب سے اکیس مارچ2009ء میں بحال کردیا گیا جس میں فوج کا دباؤ بھی شامل تھا۔ اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ موجودہ سپریم کورٹ اپنے پیش رو کے مقابلے میں زیادہ پیشہ ورانہ انداز میں کام کررہی ہے۔

ساتویں قومی مالیاتی ایوارڈ (این ایف سی ایوارڈ) پر اتفاق رائے:

این ایف سی ایوارڈ وفاقی حکومت کی جانب سے صوبوں کے درمیان مالیاتی وسائل کی سالانہ تقسیم سے متعلق ہے۔ یہ ایوارڈ ماضی میں شدید تلخیوں کا باعث رہا ہے۔ زرداری کی حکومت کے دوران ساتویں قومی مالیاتی ایوارڈ کو مشاورتی عمل کے ذریعے دسمبر2009ء میں چاروں صوبوں کی طرف سے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا جس کے نتیجے میں صوبوں کے مابین تعلقات ٹھیک ہوئے اور مالی عدم مرکزیت پیدا ہوئی۔ مشرف حکومت کی پالیسیوں سے آگے بڑھتے ہوئے این ایف سی ایوارڈ میں بجٹ میں صوبوں کا حصہ بڑھا کر پہلے سال کے لیے 56 فیصد کردیا گیا جو مشرف کے دور میں 47.5 فیصد تھا جبکہ بقیہ سالوں کے لیے یہ حصہ 57.5 کردیا گیا۔ ایوارڈ میں خیبرپختون خواہ اور بلوچستان کے لیے امدادی اقدامات کو بھی شامل کیا گیا۔

اٹھارویں آئینی ترمیم کی منظوری:

8 اپریل2008ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک آئینی ترمیم پر کامیابی کیساتھ

رائے شماری کرائی اور اتفاق رائے سے منظور کیا جس کے تحت صدر کے کئی اختیارات کو کم کر دیا گیا۔سپریم کورٹ کی جانب سے اٹھائے گئے بعض اعتراضات کے بعد2010ء کے آخری ایا م میں قومی اسمبلی کی جانب سے انیسویں ترمیم کو اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔اٹھارویں ترمیم کے ذریعے بالترتیب1985ء اور2003ء میں لائی گئی آٹھویں اور سترھویں ترمیم (جنھوں نے پاکستان کو ایک نیم صدارتی جمہوریہ میں تبدیل کر دیا تھا) کو غیر موثر کیا گیا اور صدارتی اختیارات کو محدود کیا گیا اوراس کے بجائے پارلیمنٹ اور وزیراعظم کو یہ اختیارات دے دیے گئے۔اس کے تحت آئین کی اِس شق کو ختم کر دیا گیا جو صدر کو باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے اور آئین کو معطل کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ان ترامیم کے تحت دومرتبہ وزیراعظم بننے کی حد کو بھی ختم کر دیا گیا اور یوں نواز شریف کے دوبارہ وزیراعظم بننے کی راہ ہموار کر دی گئی۔اس طرح عدالتی تقرریوں کے سلسلے میں تمام انتظامی اختیارات کو بھی ختم کر دیا گیا۔

کنکرنٹ لسٹ (ایسے شعبوں کی نشاندہی جہاں وفاق اور صوبوں دونوں کو قانون سازی کی اجازت ہے تاہم وفاقی قانون برتر ہوتا ہے) کو ختم کرکے مقننہ کے اختیار کو بھی ڈی سنٹر لائز (عدم مرکزیت) کیا گیا۔صوبہ سرحد کا نام تبدیل کرکے اکثریتی آبادی کی خواہش کے مطابق خیبر پختونخواہ رکھا گیا اگرچہ صوبے کی اقلیتی ہزارہ آبادی کی جانب سے اس پر اعتراض کیا گیا۔

ان ترامیم کے ذریعے جنرل ضیاء او رجنرل مشرف دونوں کی بعض ''یادگاروں'' کو ختم کیا گیا اور فوج کی جانب سے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے راستے میں کچھ قانونی رکاوٹیں حائل کی گئیں۔ان ترامیم کو تمام سیاسی جماعتوں کی جانب سے حمایت حاصل ہوئی اور فوج نے بھی اس عمل کی اجازت دی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ فوج کے اپنے خیال میں یہ وقت کسی قسم کی عوامی سیاست میں شامل ہونے کے لیے موزوں نہیں۔

معاشی پالیسی کا تسلسل:

زرداری حکومت نے بڑی پیمانے پر میکرو اکنامک اور سوشیو اکنامک اصلاحات پر عمل جاری رکھا جن کو مشرف نے شروع کیا تھا۔حالانکہ اس سلسلے میں حکومت پر خاصی تنقید کی گئی

کہ وہ آئی ایم ایف کے ایجنڈے کی پیروی کر رہے ہیں۔تاہم سوشیو اکنامک پہلو کو دیکھا جائے تو سٹیٹس کو کی حمایت سے موجودہ عمل جیسے غربت میں کمی کے پروگرام اور بڑے پیمانے پر سوشل پروٹیکشن پروگرام جیسے بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کو کسی حد تک استحکام حاصل ہوتا ہے۔

MashalBooks.org

2010 تک کے رجحانات

پاکستان میں2010ء کے رجحانات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے:

☆ آئین میں کی جانے والی کئی تبدیلیوں نے ضرورت سے زیادہ کھنچاؤ سے دوچار قوانین اور حکمرانی کے فریم ورک کو نظریاتی طور پر بحال کردیا ہے تاہم پاکستان بدستور اس عمل سے گذر رہا ہے جس کے تحت عدلیہ، انتظامیہ اور مقنّنہ کے درمیان ایک مناسب توازن قائم کرنے کے لیے کوشش کی جارہی ہے۔

☆ سویلین ادارے اورافراد ایک قابل عمل آئینی نظام کے قیام کے لیے تاحال ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی مرکزی اداروں جیسے عدلیہ، مقنّنہ، ایوان صدر و وزیراعظم کے کردار یا ان تمام اداروں اورفوج کے درمیان تعلقات کے حوالے سے اتفاق رائے پیدا نہیں ہوسکا۔مرکز اور صوبوں اور بعض معاملات میں صوبوں کے درمیان تعلقات بھی غیر مستحکم ہیں۔

☆ فوج کا کردار کم نہیں ہوا البتہ اس میں وقفہ آیا ہے اور یہ بدستور طاقت کا غیر منتخب شدہ مرکز ہے جو رسمی ڈھانچے اور غیرملکی حکومتوں کے ساتھ اپنے ہی تعلقات رکھتا ہے۔مشرف کے دور میں فوج کو ضرورت سے زیادہ سرگرم کرنے اور غیر فوجی معاملات میں بڑے پیمانے پر استعمال سے فوج کی جگ ہنسائی ہوئی اور فی الحال یہ سمجھتی ہے کہ اس کا کم کردار ہی اس کے مفاد میں ہے تاہم سویلین سیاستدانوں کے لیے بالعموم اور زرداری کے لیے بالخصوص اس کا عدم اعتماد اور ناپسندیدگی بدستور قائم ہے۔ایک سال تک بظاہر رہنے والے استحکام سے سویلین نظام حکومت پر اسکا اعتماد

بحال نہیں ہوسکا جس کے بارے میں بڑے پیمانے پر محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ کرپٹ ہے۔

☆ میڈیا ایک نیا اور اہم کردار ادا کررہا ہے اور پالیسیوں، جو پہلے بند دروازوں کے پیچھے طے کی جاتی تھیں، کی سختی سے پریس اور الیکٹرانک کوریج کے نتیجے میں معاملات میں شفافیت آرہی ہے۔تاہم جہاں پر اداروں کو ان کے افعال اور پالیسیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے وہاں پر احتساب میں اضافہ نہیں ہورہا۔ پریس انٹیلی جنس ایجنسیوں کی طرف دباؤ سے بدستور غیر محفوظ ہے جن کے پاس افراد اور نجی اداروں جیسے کارپوریشنز یا این جی اوز کو نقصان پہنچانے کے کئی راستے ہیں جن میں ان کو سرکاری ٹھیکوں سے محروم رکھنا، ڈرانا دھمکانا، ناروا سلوک کرنا حتیٰ کہ غائب کردینا بھی شامل ہے۔

☆ پاکستان کے سیاسی کلچر میں جمہوریت واپس آتی دکھائی دے رہی ہے اور پارٹیاں زیادہ ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے لگی ہیں۔چند سال پہلے تک کسی جنرل کے لیے یہ لطیفہ سنانا آسان تھا کہ پاکستانی سیاست دانوں کی پہلی ترجیح یہ ہوتی کہ ان کے پاس اقتدار ہونا چاہیے اور ان کا دوسرا انتخاب یہ ہوتا کہ حکومت فوج کرتی تھی۔ حالیہ چند آزاد الیکشنوں کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاستدان اب اپنی ذمہ داری کو زیادہ سنجیدگی سے لینے لگے ہیں۔

☆ نظام نے کوئی نیا لیڈر پیدا نہیں کیا اور سیاست پر دو خاندانوں کا ہی قبضہ ہے اور جماعتی جمہوریت جس کے ذریعے لیڈر سامنے آتے ہیں وہ موجود ہی نہیں۔اس کے بجائے نئے لیڈر عسکری قیادت میں سے ابھر رہے ہیں جو چاہتے ہیں کہ پاکستان کو مکمل طور پر تبدیل کردیا جائے یا اس معاشی طور پر تباہ حال ریاست میں انہیں تباہ کرنے کے لیے کچھ زیادہ مل جائے۔

☆ پاکستان علاقائی اور عالمی سفارت کاری میں سرگرم کردار ادا کرتا ہے اور افغانستان میں یہ جو اثاثے رکھتا ہے وہ مغرب کے لیے اہم ہیں۔ یہ امید رکھتا ہے کہ افغانستان کے حوالے سے کسی بھی سودے بازی میں اس کا حصہ ہو لیکن یقینی طور پر اس کے لیے کوئی فیصلہ امریکہ یا افغان حکومت کے دیگر حامیوں کی جانب سے ہی ہوگا اور اس کے نتیجے میں افغانستان اور بھارت دونوں کے ساتھ تعلقات مزید خراب ہوں گے۔

☆ پاکستان پر غیرملکی حکومتوں جن میں بالخصوص امریکہ اور چین بلکہ سعودی عرب کے اثرات بدستور قابل ذکر ہیں اور حکومت کوئی بھی اہم فیصلہ ان طاقتوں کے ساتھ تعلق کو مدنظر رکھے بغیر نہیں کر سکتی۔

☆ مشرف حکومت کے دوران مڈل کلاس طبقے اور اشرافیہ میں امریکہ مخالف جذبات میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہوا اور نوجوان طبقے میں خاص طور پر اس میں اضافہ جاری ہے جو کہ پاکستانی آبادیات میں بہت اہم تبدیلیوں کی وجہ بن چکا ہے۔

☆ کچھ مقامی نوعیت کے عسکریت پسند گروہوں نے اپنی کاروائیوں کا دائرہ بڑھایا اور لشکرطیبہ القاعدہ کے ساتھ جوڑ توڑ قائم کرتی دکھائی دی جو امریکہ، برطانیہ اور جنوبی ایشیا میں کام کرتے ہوئے علاقائی اور عالمی رسائی حاصل کرنے کے لیے سرگرم ہے۔

☆ گذشتہ سال کے بعد سے راولپنڈی اور اسلام آباد میں دہشت گردی کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ لاہور اور پاکستان کے دیگر علاقوں میں فرقہ وارانہ تشدد جاری رہا۔کراچی ایک متشدد شہر رہا جسے وسط2010ء میں رینجرز کے کنٹرول میں لینا پڑا۔ یہ بات کہنا مشکل دکھائی دیتا ہے کہ آیا کہ دارلحکومتی شہر میں تشدد اس لیے کم ہوا ہے کہ وہاں پولیس کی نگرانی میں اضافہ کیا گیا اور اسلام آباد کا ایک بڑا حصہ اچھے طریقے سے قلعہ بند کیا گیا ہے یا پھر یہ مرکزی انتہاپسند گروپوں کے ساتھ کسی قسم کی سودے بازی کا نتیجہ ہے جن کے انفراسٹرکچر کو چھوا نہیں گیا۔

☆ 2011ء تین سال قبل بینظیر کے قتل کی برسی کی تقریبات کے ساتھ شروع ہوا جو چار جنوری کو ان کے قریبی ساتھی اور پیپلز پارٹی کے سیکولر لیڈر گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قتل کے باعث ادھوری رہ گئیں۔ سلمان تاثیر کو اس پاداش میں قتل کیا گیا کہ انہوں نے توہین رسالت کے قانون کے حوالے سے کسی قسم کی تنقید کی تھی۔ان کے سیکیورٹی گارڈ نے انہیں دن دیہاڑے فائرنگ کر کے قتل کیا جس کا کہنا تھا کہ وہ سلمان تاثیر کے خیالات کی وجہ سے مشتعل ہوگیا تھا۔قاتل گارڈ پنجاب کی ایلیٹ پولیس فورس سے تعلق رکھتا تھا جس کے ہاتھوں تاثیر کے قتل کے باعث لبرل پاکستانی مایوسی اور خوف کا شکار ہوگئے۔

تجزیاتی جائزہ

پاکستان کا مستقبل کیا شکل اختیار کرتا ہے اس کا تعین کرنے کے لیے تین مسائل پر بحث کی ضرورت ہوگی۔ پہلا مسئلہ امید اور ناکامی کے بارے میں مرصع بیانی (rhetoric) ہے۔ دوسرا مسئلہ ترتیب اور تیسرا مسئلہ جو ہے وہ مسئلے کے حجم کے تعین میں مشکل ہے۔

پاکستان کے بارے میں پیشگوئیوں کو عام طور پر دو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ایک تو قنوطیت پسند ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ معاملات خراب سے خراب تر ہوں گے اور دوسرے رجائیت پسند ہیں جن کا خیال ہے کہ تاریخ ایک مرتبہ پھر اپنا رخ بدلنے والی ہے۔ پاکستانی نژاد امریکی سکالر احمد فاروقی محتاط حد تک رجائیت پسند ہیں جن کا کہنا ہے کہ ایک دور ایسا تھا جب فرانس اور برطانیہ بھی زوال میں غرق ہوگئے تھے لیکن آخر کار انہوں نے عظمت پالی۔ این آئی سی رپورٹ کے مشیران پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے شدید شبہات میں مبتلا ہیں اور کئی بھارتی مبصرین، کچھ آزاد خیال پاکستانی اور اسلامی قدامت پرست اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان اپنی فطرت اور اپنے کلچرل ڈی این اے کے ہاتھوں ہی تباہ ہو چکا ہے اور یہ کہ ٹرانسفارمیشن یا انہدام ناگزیر ہے۔ کچھ کے لیے ناکامی کی ان امیدوں میں کسی حد تک ایذا پسندی شامل ہے۔

دوسری جانب زمانہ موجود کے کچھ لکھنے والے امید کے دامن کو تھامے ہوئے ہیں اور محتاط حد تک رجائیت پسند ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے پاس کچھ ایسے جانے مانے اور اہم اثاثے ہیں جنہیں وہ کسی مثبت تبدیلی یا ٹرانسفارمیشن کے لیے ایک شہادت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ایک ممتاز ریٹائرڈ پاکستانی سفارت کار طارق فاطمی کے الفاظ ہیں کہ ”اگر پاکستان کے حجم، محل وقوع اور اس کے لوگوں کے معیار کی طرف دیکھا جائے تو پاکستان کو اپنی صلاحیتوں کے حوالے سے پر اعتماد اور اپنے مستقبل کے لیے پر امید ہونا چاہیے اور باقی دنیا کو بھی ایسے ہی سوچنا چاہیے کہ ہم جانتے ہیں کہ پاکستانیوں نے جب بھی کچھ کرنے کی کوشش کی اور جس کام کا بھی بیڑا اٹھایا آخر کار اس میں کامیاب ہوئے۔“

امید نہ تو کوئی پالیسی ہے اور نہ ہی منصوبہ کا کوئی حصہ لیکن اسے شدت کے ساتھ کامیابی یا ناکامی کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ یہ امید کہ حالات اچھے ہوجائیں گے یا

ہو سکتے ہیں ایک ایسا جذبہ ہے جو فطرت انسانی میں بہت گہرائی کے ساتھ پایا جاتا ہے تاہم یہ ایک بدترین سوچ۔۔۔تباہی کے لیے پیش بندی۔۔۔۔ کا عکس آئینہ بھی ہے۔امید کے بغیر بہت کم تبدیلی آئے گی اور ایک ایسی دنیا پیدا ہوگی جس پر ہلاکت پسندوں اور قنوطیت پسندوں کا غلبہ ہوگا۔ اسی طرح اگر امید کی بہت زیادتی ہو یا اندھی رجائیت پسندی ہوتو یہ بھی انتہاپسندوں اور یوٹو پیائی تحریکوں کے لیے ایک بنیاد بن سکتی ہے۔

ترتیب یا تنظیم ایک اور اہم ایشو ہے کیونکہ یہ کسی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی ترجیحات کا تعین کرے۔ایک بھارتی مطالعے کے مطابق پاکستان کے مستقبل کی خاکہ بندی کرنے والے تمام عوامل اہم ہیں۔لیکن کیا کوئی ایسے عوامل بھی ہیں جو دیگر عوامل سے زیادہ اہم ہیں۔اور کیا ہم اس بات کا تعین کرسکتے ہیں کون سے عوامل زیادہ اہم ہیں لیکن ایسے ہیں جن کو قابو میں نہیں لایا جاسکتا اور کون سے ایسے ہیں جنہیں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا کچھ یا تمام عوامل ایسے ہیں جو پاکستان کے مستقبل کو تشکیل دیتے ہوئے اس طریقے سے کام کریں گے جس میں وہ کامیابی سے ملتی جلتی ہوئی کسی چیز کی طرف بڑھیں گے تاہم اس سوال کا جواب حاصل کرنا بھی اتنا ہی مشکل ہے۔یہ بات یقینی ہے کہ ایسے کئی عوامل ہیں جو پاکستان کے مستقبل کے لیے بہت نازک ہیں۔تاہم ان میں سے کوئی بھی عامل اپنی ذات میں فیصلہ کن نہیں ہے۔اندرونی سماجی اور معاشی زوال جاری ہے لیکن یہی حال پاکستانی سیاسی اسٹیبلشمنٹ کے غیر مربوطیت،اس کے فوج سے تعلق اور دوست اور دشمن طاقتوں کے کردار کا ہے۔آگے بڑھیں تو کم از کم چھ ایسے ضروری حالات ہیں جو کہ ایک مستحکم پاکستان کے لیے ضروری ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی خاطرخواہ نہیں اور ان کی تنظیم اور نظم اوقات بھی بہت اہم ہے۔

ہماری رائے ہے کہ اس سوچ کے بارے میں سادگی لانے کی ضرورت ہے کہ کیا جاسکتا ہے اور یہی سب سے درست موقف ہوگا کیونکہ ہم ایسے واقعات کے بارے میں بحث کررہے ہیں جن کو سمجھنا مشکل ہے۔یہاں ہم سابق سوویت یونین کے ایک سفیر کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں جس نے کہا تھا:''میں یہ نہیں جانتا ہے کہ پاکستان کس سمت میں بڑھ رہا ہے لیکن ایک بار یہ وہاں پہنچ گیا تو اس کے بعد میں بتاسکوں گا کہ ایسا ناگزیر کیوں تھا۔''

اس کے بعد تیسرا مسئلہ حجم کا ہے۔سائنسدان حجم کوایک مسئلہ قرار دیتے ہوئے اسکے

پیرامیٹرز کو مسئلے کے حل کی طرف پہلا قدم کہتے ہیں۔ پاکستان کو درپیش چیلنجز اور صلاحیتوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے سر بلیری سائنوٹ اس گلاس کی مثال کو استعمال کرتے ہیں جسے کوئی آدھا خالی اور کوئی آدھا بھرا ہوا کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید گلاس بہت بڑا ہے۔ یہ جسامت کے تعین کا نیا طریقہ ہے: اگر پاکستان کی صلاحیتیں کم ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے عزائم بھی بہت زیادہ ہوں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ترجیحات بہت اہم ہیں اور پاکستان کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں سے کون سی ترجیحات فوری توجہ چاہتی ہیں اور کون سی ثانوی اور اس قابل ہیں کہ انہیں موخر کردیا جائے۔ اس طریقے سے ریاست کی صلاحیتوں کو سب سے اہم ترین مسائل کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔

''گلاس بہت بڑا ہے'' کے تصور کا ایک پہلو یہ ہے کہ پاکستان نے ماضی کا بہت بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ جب اس کے سب سے اہم ہمسائے اور اس کے سب سے اہم بین الاقوامی اتحادی کے ساتھ تعلق کی بات ہوتی ہے تو اس کا بیانیہ مظلومیت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہندو وغلبہ کا شکار ہونے کی پاکستان کی خود خیالی تمام بے اعتباریوں کی ماں بننے کی وجہ بنتی ہے اور ایک ایسی بے اعتمادی جنم لیتی ہے جسے کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کی جڑ بھارتیوں کے غلبہ پسند، غیر سنجیدہ اور ناقابل اعتبار ہونے سے پھوٹتی ہے اور اس سلسلے میں پاکستان تعلقات کو معمول پر لانے میں کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے کیونکہ بھارتی ہندو کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بھی برابر کے ناقابل اعتبار ہیں اور انہوں نے بار بار اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اعتماد کسی مسئلے کا حصہ ہے تو غیر فانی نوعیت کا ہے کیونکہ خودمختار ریاستوں کے بیچ کبھی بھی خاطر خواہ اعتماد موجود نہیں ہوتا تاہم وہ اعتماد اور تصدیق کے بارے میں سوچتے ہیں۔

جہاں تک امریکہ کے افعال کا تعلق ہے تو بہت سے پاکستانیوں کا ماننا ہے کہ اسی کی دہائی کی افغان جنگ، پریسلر ترمیم اور دیگر نقصان دہ قسم کی دہری پالیسیاں اس بات کی حالیہ ترین مثالیں ہیں کہ امریکہ پاکستان کو استعمال کرتا ہے اور پھر چھوڑ دیتا ہے۔ جنگ نے پاکستان کو غیر مستحکم کیا ہے اور ایٹمی پابندیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے پروگرام کے خلاف ہیں جس کے بارے میں اس سے پہلے امریکہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مزید حالیہ ترین مثالیں افغانستان پر امریکہ کا حملہ ہے جو اس نے طالبان کے خلاف

کیا (جنھوں نے بذات خود امریکہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا) اور بنیاد پرست عناصر کو سرگرم کرکے پاکستان کو مزید عدم استحکام کی طرف گامزن کیا۔ان تمام واقعات کا امریکی بیانیہ یقینی طور پر بالکل مختلف ہے اور پاکستان بھارت کی طرح پاکستان امریکہ کے درمیان اعتماد میں بھی ایک گہری خلیج ہے۔

چار جھرمٹ یا مجموعے

جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو یہاں پر سب کچھ اہم اور سب کچھ غیر یقینی ہے۔پاکستان کے مستقبل کو تشکیل دینے والے اہم ترین عوامل کے بارے میں بحث کرنے کے لیے ہم ان عوامل، جن کی تعداد انیس ہے، کی گروہ بندی چار مجموعوں یا جھرمٹوں کی صورت میں کر سکتے ہیں۔ پہلا مجموعہ یا جھرمٹ اندرونی معاملات کے حوالے سے ہے جن میں آبادیاتی مسائل، شہری معاملات، معیشت اور تعلیم شامل ہیں۔ یہ سب آپس میں قریبی طور پر منسلک ہیں ماسوائے معیشت کے جو کہ پالیسیوں میں تبدیلیوں کا نشانہ بنتی رہتی ہے اور دیگر کے مقابلے میں کم قابل تبدل ہے۔دوسرا جھرمٹ یا مجموعہ پاکستان کے لوگوں کے اجتماعی تشخص کے گرد گھومتا ہے جو اپنی شناخت علاقائی، نسلی اور ریاستی بنیادوں پر کرتے ہیں۔تیسرا جھرمٹ یا مجموعہ پاکستانیوں کی ایک مجموعی ہدف کے خلاف یا حمایت میں کام کرنے یا کسی ہدف کے تعین کے بارے میں خود ہی طے کرنے کی ان کی قابلیت کے بارے میں ہے۔اس میں ہم بیوروکریسی اور حکومتی ڈھانچے، اس کے افسران، بالخصوص فوج کے، کی دوسروں کے ساتھ کام کرنے کی قابلیت اور ان کے درمیان رابطوں کے ذرائع کو شامل کریں گے۔آخری اور حتمی جھرمٹ یا مجموعہ اہم غیر ملکی ریاستوں کی پالیسیاں اور رویہ اور گلوبلائزیشن کا عمل ہے۔اگرچہ گلوبلائزیشن پاکستان میں مختلف طریقوں سے اثر انداز ہورہی ہے تاہم یہ پاکستان کا ماحول ہی ہے جو معاشی امکانات کو تشکیل دیتا ہے اور عزائم اور پاکستان کے خصوصی تشخص پر اثر انداز ہوتا ہے اور مدد یا رکاوٹ کی صورت میں ریاست کی کارکردگی پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔آیئے اب ان کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں:

(1) آبادیات، تعلیم، شہری معاملات اور معیشت

آبادیات

آبادیاتی رجحانات جو دونوں قسم کی خصوصیات رکھتے ہیں یعنی قابل اعتبار بھی اور مشکل سے تبدیل ہونے والے بھی، آئندہ دس سال یا اس سے زیادہ عرصے کے لیے بالکل واضح ہیں۔ یہ پاکستان کے مستقبل پر مختلف طریقوں سے اثرانداز ہوں گے۔

اول، پاکستان ان ملکوں میں سے ایک ہے جہاں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا سامنا ہے۔ یہ جلد ہی ان ملکوں میں شامل ہوجائے گا جہاں آبادی میں نوجوانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ کچھ ملک جیسے افریقہ، مشرق وسطیٰ اور لاطینی امریکہ اور جنوبی ایشیاء ممالک ایسے ہیں جہاں اموات کے مقابلے میں شرح پیدائش کہیں زیادہ ہے چنانچہ وہاں گروتھ ریٹ سالانہ 2.0 فیصد ہے۔ پاکستان نیپال، یمن، افغانستان اور ڈیموکریٹک ری پبلک آف کانگو کے ساتھ ایسے ممالک میں شامل ہے جہاں آبادی ہر تیس یا پینتیس سال دوگنا ہوجاتی ہے۔

2009ء میں برٹش کونسل کی جانب سے کیے جانے والے ایک مطالعے کے مطابق پاکستان کی نصف آبادی ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کی عمر بیس سال سے کم ہے جبکہ دو تہائی آبادی کی عمر تیرہ سال سے بھی کم ہے۔ علاقائی معیارات بالخصوص دیہی علاقوں کے حوالے سے بھی شرح پیدائش زیادہ ہے۔ پچاس سال سے بھی کم عرصے کے دوران آبادی تین گنا ہوچکی ہے اور آئندہ بیس سالوں کے دوران امکان ہے کہ اس میں مزید ساڑھے آٹھ کروڑ کا اضافہ ہوجائے گا۔ پاکستان کی شرح اموات اور پیدائش کی کم سے زیادہ کی طرف آبادیاتی ٹرانزیشن رک چکی ہے۔ پاکستان کی موجودہ اٹھارہ کروڑ کی آبادی میں غالب تعداد اٹھارہ سال کی عمر کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ملکی آبادی کا کرو(curve) ایک کلاسک اہرام کی شکل والا ہے۔ اگلے پندرہ سال کے دوران یہ نیچے کی طرف سے بھاری ہوگا۔ آبادی میں اس قدر اضافے کی صورت میں زیادہ خوراک، زیادہ توانائی اور مرد آبادی کے لیے زیادہ نوکریوں کی ضرورت ہوگی۔ علاوہ ازیں آبادی میں مزید اضافے کی صورت میں ووٹروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں ریاست پر بھی دباؤ میں اضافہ ہوگا کہ وہ انہیں بنیادی سہولیات فراہم کرے۔

دوئم، پاکستان میں شہرمکانی بڑھ رہی ہے۔ ملک کی موجودہ شہری آبادی لگ بھگ پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ ہے جو 1951ء میں 17 فیصد سے بڑھ کر 2005ء میں 35 فیصد ہوچکی ہے۔ تاہم دیہی آبادی اس قدر بڑی ہے کہ اسکے کچھ شہر تو مکمل طور پر شہر بھی نہیں بلکہ دیہاتی

اور قبائلی آبادیوں کا ایک امتزاج ہے جو کہ ایسے علاقوں میں آباد ہو گیا ہے جو بنیادی طور پر میونسپل کارپوریشن کے طور پر بنائی گئی تھیں۔ ملک میں شہر مکانی نے سکون اور معاشرت لانے کے بجائے تاریخی حریفین کے لیے جنگ کے نئے میدان بنا دیے ہیں اور بعض معاملات میں تو ایسے گروپ جو پہلے الگ الگ رہتے تھے ان کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا ہے جہاں اب شہروں کے تناظر میں جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں کراچی کی مثال خاص طور پر دی جاسکتی ہے جہاں شہر کے رہائشیوں کو سہولیات کی فراہمی کے لیے کئی قسم کی سیاسی جماعتیں سرگرم ہو چکی ہیں۔ مزید یہ کہ اس سے شدید قسم کی نسلی کشیدگی نے بھی جنم لیا ہے جو مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان کشمکش کی صورت میں ہے جبکہ ان دونوں اقوام کو پشتونوں کی ایک بڑی ہجرت کا بھی سامنا ہے جو جنگ سے متاثرہ افغان سرحدی علاقوں سے وہاں پر آ رہے ہیں۔ اسلام آباد میں مساجد جیسے لال مسجد سوات اور خیبر پختون خواہ سے تعلق رکھنے والے بنیاد پرستوں کے اڈوں میں بدل گئیں۔ بنیاد پرستوں کی ناقابل قبول جنتیں پورے پاکستان میں فروغ پا رہی ہیں اور بعض معاملات میں یہ نسلی آبادیوں کے ساتھ گھل مل چکی ہیں۔ اگر پولیس کی حالت ٹھیک ہو تو اس معاملے کو قابو کیا جاسکتا ہے تاہم ایسا نہیں ہے اور پولیس خود بھی سیاست دانوں اور عسکریت پسندوں اور بعض اوقات عسکریت پسند وں اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان رابطوں کی وجہ سے بے بس ہے۔

قومی معیشت میں میٹروپولیٹن علاقے جیسے کراچی اور لاہور اور دیگر شہری مراکز مضافاتی علاقوں کے خلاف توازن کو متاثر کریں گے۔ روایتی طور پر پاکستان ایک زرعی معیشت ہے۔ اسے اپنی معیشت کو اس طریقے سے استوار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ویلیو چین کو پہلے زراعتی بنیادی پر قائم انڈسٹری اور پھر مینوفیکچرنگ سے منسلک کرنا ہوگا۔ بین الاقوامی طور پر دیکھا جائے تو ترقی پذیر ممالک میں1970ء کی دہائی سے یہی رجحان چلا آ رہا ہے اور ان میں سے کئی اب گلوبل سروسز میں جا رہے ہیں جس میں بھارت کی مثال سرفہرست ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں زراعت ان کے جی ڈی پی کا اوسطاً صرف بیس فیصد ہے۔ پاکستانی زراعت کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہوگا۔ پاکستان میں جب بھی نئی مردم شماری عمل میں لائی جائے گی تو یہ ان رجحانات کی تجدید کرے گی اور پاکستان کے سیاسی نقشے کو تبدیلی سے دوچار کرے گی۔ اگر الیکشن کی حدود نئے سرے سے متعین ہوتی ہیں تو اس کے

نتیجے میں صوبائی اسمبلیوں اور مرکزی پارلیمنٹ میں شہروں کے لیے نشستوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ایسا ہونے کی صورت میں پاکستان کی جاگیرداری سیاست کو چیلنج درپیش ہوگا اور دیہی اشرافیہ کی جانب سے اس کے خلاف مزاحمت کا امکان ہوگا۔

سوئم، یہاں پر مبینہ آبادیاتی توازن کے حوالے سے بھی سوال موجود ہے کہ آیا کہ آبادی کو پاکستان کے لیے فائدے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔مالتھوسی نظریے پر یقین رکھنے والوں کے درمیان پرانی بحث کہ آبادی میں اضافہ تباہ کن ہوتا ہے جبکہ آبادی میں اضافہ حامیوں کی جانب سے جولیان سائمن کی مثال کہ زیادہ آبادی فائدہ مند ہے کا جواب یہ ہے کہ محض کثرت آبادی اندرونی یا داخلی مسائل کی تنہا ذمہ دار نہیں۔بڑے پیمانے پر جرائم کی وجہ کبھی بھی مکمل طور پر آبادی کی زیادتی نہیں رہی۔افزائش آبادی ایک چیلنج ہے خطرہ نہیں۔جو چیز بنیادی ہے وہ ریاست کی اہلیت اور جوابی اقدامات ہیں۔

اس معاملے میں پاکستان کی صورتحال خراب ہے۔آبادیاتی توسیع کے حوالے سے انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش اور بھارت جیسے ملکوں اور مسلم اکثریت والی ریاستوں، یا ایک بار پھر بھارت کی مثال جہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اقلیت موجود ہے وہاں پر ریاست یا مقامی سول سوسائٹی کی جانب سے جوابی اقدام بہت طاقتور اور مثبت رہا ہے۔ان ملکوں نے ایسی پالیسیاں ترتیب دیں جن کا مقصد رواداری اور جیو اور جینے دو کا کلچر پیدا کرنا تھا باوجود یکہ ان ریاستوں میں اسٹیبلشمنٹوں میں مذہبی طاقتوں کا بھی بہت زور رہا ہے۔پاکستان میں قدامت پرست اسٹیبلشمنٹ بہت مضبوط ہے اور چونکہ پاکستان ثقافتی طور پر جنوبی ایشیا کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس لیے اس کا مذہبی بیانیہ بنیادی طور پر اس اسلامی بیانیے سے تشکیل پایا ہے جو کہ قدامت پرست عرب ریاستوں اور ایرانی انقلابی ماڈل پر استوار ہے۔

تعلیم اور نوجوان

آبادی سے فائدہ اٹھانے کے لیے تعلیم بنیادی کنجی ہے۔یہاں پر ایک تھیوری موجود ہے کہ یہ ایک موقع ہے کہ نوجوان نسل کو تعلیم دی جائے اور چھلانگ لگا کر ایک زیادہ جدید اکانومی میں شامل ہولیا جائے جس میں اعلیٰ طرز کی مینوفیکچرنگ اور سروسز کی خصوصیات ہوں جس کو پوری دنیا میں خریدا اور سراہا جائے۔ اس معاملے میں پاکستان کی حالت بھارت اور

بنگلہ دیش سے بھی خراب ہے اور یہ دونوں ملک اپنی اس صلاحیت کو فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ان میں اپنی نوجوان آبادی کو تعلیم یافتہ بنانے کے حوالے سے ہے۔

پاکستان میں صرف نصف بچے پرائمری سکول اور ایک چوتھائی سیکنڈری سکول میں جاتے ہیں اورصرف پانچ فیصد کسی قسم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔پاکستان میں بڑھتی ہوئی ان پڑھ نوجوان آبادی کو تربیت کی فراہمی کے لیے کسی قسم کی قومی تعلیمی کور یا کسی قسم کا کریش پروگرام تیار کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں۔ ایک تجویز دی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ آرمی ایجوکیشن کور کو چھاؤنیوں سے باہر تعینات کیا جائے تا کہ ان کے ذریعے قومی تعلیمی نظام کو بہتر بنایا جائے تاہم فوج نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ بیرون ملک سے بڑی تعداد میں اساتذہ اور انسٹرکٹر کو ملک میں واپس لانے کا بھی کوئی منصوبہ نہیں اوراس وقت ملک کی امن وامان کی حالت ایسی ہے کہ ان میں سے بہت کم اس ملک میں آکر رہنے پر آمادہ ہوں گے۔چنانچہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اس خلاء کو ایک طویل عرصے سے مذہبی مدارس پر کررہے ہیں جن کی تعلیم کی اب اس جدید دنیا میں افادیت بہت کم رہ گئی ہے۔نوجوانوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا آئیڈیا بہت مقبول ہے لیکن ریاست کی جانب سے قومی یا صوبائی سطح پر کوئی موثر اقدام نہیں کیا گیا۔اس کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ نوجوانوں کو جہاں سے جیسی بھی تعلیم مل رہی ہے وہ حاصل کررہے ہیں۔مختلف سروے جو کیے گئے ہیں ان کے نتائج المناک ہیں: نوجوان نسل کے بارے میں امکان ہے کہ وہ درمیانی عمر اور ناراض نسل میں بدل جائے گی اور جدید دنیا کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ عزائم اور مہم جوئی کی طبعیت رکھنے والوں کے لیے یہ نسل بہت اہم ہوگی اور وہ اپنی انتہاپسند تحریکوں کو آگے بڑھاتے رہیں گے جو کہ پاکستان نوجوانوں کو بھرتی کرنے کے معاملے میں فوج کو بھی پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔

پاکستانی حکومت مجموعی طور پر ریاست کی اس بنیادی ناکامی سے نمٹنے میں ناکام ہو چکی ہے۔اس کے بجائے نجی تعلیمی نظام پھل پھول رہا ہے جس کا معیار قابل بھروسہ نہیں۔خرابی کا آغاز اوپر سے ہوتا ہے جہاں ملک میں پی ایچ ڈی لوگوں کا سیلاب لانے کے لیے اس خیال خام کے ساتھ بڑی بڑی اور غیر حقیقی سکیمیں تیار کی گئیں کہ اس طرح پاکستان کا مجموعی تعلیم نظام اور تحقیق کی صلاحیت بہتر ہوگی۔ یہ چیز پاکستان کے سیاسی کلچر کے خلاف تھی جو کہ ماسوائے قومی سلامتی کے چند شعبوں کے، تحقیق یا عوام کی تعلیم کے حوالے سے کسی قسم کی

ہمدردی نہیں رکھتا۔افریقہ کے بعد پاکستان میں ڈاکٹروں کا ان ٹیک سب سے کم ہے اور ہائرایجوکیشن میں طالب علموں کی جو تعداد ہے اس میں زیادہ تر غیرملکی تنظیموں جیسے امریکہ کی ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ کی امداد سے پڑھ رہے ہیں جو اکثر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان واپس نہیں آتے۔جو تحقیق کار پاکستان واپس آتے ہیں وہ بھی یہاں کے ماحول کو خوشگوار نہیں پاتے اور کسی حد تک یہاں پر رہنے کی کوشش کے بعد دوبارہ ملک سے واپس چلے جاتے ہیں۔خطے کے شاندار تعلیمی اداروں کے ساتھ رابطوں کے بغیر پاکستان کی سکالر شپ اور تحقیق فرسودہ ہوجائے گی۔پاکستان جب معرض وجود میں آیا تو اس کے پاس صرف ایک یونیورسٹی اور محض چھ سو طالب علم تھے جواب بڑھ کر143یونیورسٹیاں اور دس لاکھ طالب علم ہوگئے ہیں۔موجودہ پاکستان برصغیر کے اس خطے پر مشتمل ہے جہاں تعلیم کی کوئی روایت نہیں تھی اور یہاں پر صرف اچھے فوجی یا تاجر پیدا ہوتے تھے۔ایک سکالر حامد قزلباش کا کہنا ے کہ پاکستانی سکالروں کو ہمیشہ جو پیغام ملا ہے وہ یہ ہے کہ ''تمہارے کام کی کوئی ضرورت نہیں۔''

حامد قزلباش اور دیگر سکالرز کا کہنا ہے کہ پاکستانی حکومت اور اشرافیہ تعلیم کو اپنے لیے اور ریاست پر اپنے کنٹرول کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان میں ایک گمشدہ نسل پیدا ہوچکی ہے جسے پاکستان میں2002ء کے بعد کی جانے والی اصلاحات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔اس کا نتیجہ بقول ان کے یہ ہے کہ جن لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا وہ اب ہمیں سزا دینے کے لیے مختلف طریقے ڈھونڈ رہے ہیں۔

37

متوسط طبقے یا مڈل کلاس کا قصہ

امریکی سکالر اور امریکی محکمہ خارجہ کے ایک اہلکار ولی ناصر کا کہنا ہے کہ مسلم اکثریت کے حامل ملکوں میں نئی مڈل کلاس کے سامنے آنے سے ان ریاستوں میں بڑے پیمانے پر مثبت تبدیلی آسکتی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سماجی طور پر بظاہر جدت پسند یا قدامت پرست دکھائی دیتی ہے تاہم وہ کہتے ہیں کہ صدیوں سے روایتی نظاموں کے شکنجے تلے دبی ہوئی ان ریاستوں میں مڈل کلاس کے ابھرنے سے سماجی اور معاشی تبدیلیوں کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور یہ نئی مڈل کلاس مغرب کے ساتھ زیادہ آسانی اور سہولت کے ساتھ کام کرسکے گی۔ پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ میں مڈل کلاس صارفین کی تعداد ایک ارب تک پہنچ چکی ہے اور بیرونی دنیا کے ساتھ اور خود مشرق وسطیٰ کے اندر کشادگی، تجارت اور معیشت کے لیے یہ ایک بڑی طاقت ہے۔ پاکستان کے لیے یہ بات کسی حد تک درست ہے جہاں اگرچہ معاشی ترقی کی رفتار سست ہے لیکن ایک نئی مڈل کلاس ابھرتی دکھائی دے رہی ہے جسے الیکٹرانک میڈیا کے تیزی سے پھیلاؤ کے نتیجے میں ایک نئی توانائی اور آواز میسر آئی ہے اور جس نے ایک عام پاکستانی کو دنیا کے بارے میں آگاہی سے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ منور کردیا ہے۔

مڈل کلاس کو جمہوریت کی بنیاد قرار دینے کے پیچھے دلیل یہ ہے کہ یہ سیاسی کھلے پن،

MashalBooks.org

تجارت اور ہمسایوں سے بہتر تعلقات کا فائدہ لینے کے لیے کھڑی ہوتی ہے اور دیگر جمہوریتوں بشمول امریکی جمہوریت کے لیے ہمدردی رکھتی ہے۔جوناتھن پیرس کا کہنا ہے کہ یہ تمام چیزیں آخرکار بیرونی تعلقات اور مقامی وسائل پر زیادہ سویلین کنٹرول سے جا کر ملتی ہیں۔لیکن یہ دلیل یوروسنٹرک ویو''بورژوا نہیں تو جمہوریت نہیں''میں جا کر دم توڑ دیتی ہے۔شہری مڈل کلاس اور جمہوریت کے لیے دباؤ میں کوئی جبلی تعلق موجود نہیں۔ایشیا اورلاطینی امریکہ بھر میں اجتماعی سیاسی مفادات کے لیے متحد یا متحرک ہونے کی بہت کم مثالیں مڈل کلاس کی طرف سے قائم کی گئیں(انڈونیشیا میں سہارتو اور موجودہ دور میں تھائی لینڈ کی مثالیں) جہاں اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے معاشی اور مادی مفادات کے لیے غیر قانونی اور ناجائز آمرانہ حکومتوں کی حمایت کی۔پاکستان کی مڈل کلاس کی مثال بھی اس سے مبرا نہیں جہاں اگرچہ کرپٹ سیاستدانوں کے لیے کسی قسم کی برداشت کا مظاہرہ کرتی دکھائی نہیں دیتی اور جمہوریت پر امن وامان کو فوقیت دیتی ہے۔مزید یہ کہ بھارت کے ساتھ تجارت کا امکانی فائدہ لازمی نہیں کہ کسی مخصوص کلاس کو ہو بلکہ الٹا اس کو بھارت مخالف عناصر، جن سے پاپولرمیڈیا اور مڈل کلاس کا تعلیمی نظام بھرا پڑا ہے، کی جانب سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مڈل کلاس کا ابھرنا یا اسکی افزائش ہوسکتا ہے کہ کوئی ضروری شرط ہو تاہم پاکستان میں جمہوریت کے قیام کے لیے یہ کافی نہیں۔بھارت میں جمہوریت تھی اور ہے حالانکہ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں شامل رہا ہے۔چین میں ویت نام کی طرح بڑی مڈل کلاس ہے لیکن کمیونسٹ پارٹیاں وہاں پر جمہوریت کو پھٹکنے بھی نہیں دیتی جبکہ کنزیومرازم کو کھلی چھٹی ہے۔پاکستان میں ایک بڑی مڈل کلاس کے لیے معاشی بنیاد تاحال موجود ہی نہیں۔معیشت اور معاشرہ بدستور انتہائی اہرامی شکل کے ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نئی اور ابھرتی ہوئی مڈل کلاس کو معاشی حقائق کے باعث رکاوٹوں کا سامنا ہوگا جن میں سے ایک گذشتہ چند سال کے دوران تیزی سے بڑھتا ہوا افراط زر ہے جس نے بڑی تعداد میں شہریوں کو خطرات سے دوچار کر رکھا ہے اوران کی زندگیوں کو معاشی لحاظ سے غیر محفوظ بنا دیا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ایک طرف انہیں طبعی خطرات کا سامنا ہے جن میں دہشت گردی کے واقعات اور حالیہ سیلاب اوراس سے پہلے تباہ کن زلزلہ بھی شامل ہیں۔

پاکستان میں فوج وہی کردار ادا کر رہی ہے جو چین اور ویت نام میں کمیونسٹ پارٹیوں کا ہے کیونکہ یہ فوج ہی ہے جو نہ صرف اپنے مفادات بلکہ ان مفادات جن کو یہ بنیادی سمجھتی ہے کہ محفوظ کرنے کے لیے نظام کو ریگولیٹ کرتی ہے۔آخر میں مزید یہ ہے کہ پوری تاریخ گواہ ہے کہ مڈل کلاس کو اگر اکھاڑا جائے اور خطرے میں ڈالا جائے تو یہ انقلابی تحریکوں کی بنیاد ڈالتی رہی ہے اور ضروری نہیں کہ یہ انقلاب ہمیشہ پرامن اور جمہوری ہوں۔

مڈل کلاس کی جانب سے اصلاحات کی امید محض امید ہی ہے اور کوئی یقینی عمل نہیں۔حتیٰ کہ تاریخ کے متوازی کچھ ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک محروم اور ناراض مڈل کلاس آسانی کے ساتھ کسی انقلابی سمت میں جاسکتی ہے جو پاکستان کی کئی پالیسیوں کو مسترد کرتی ہے۔ انتہاپسندی گلے لگاتی ہے اور پاکستان کو آمرانہ طرز حکومت حتیٰ کہ تقسیم کے راستے پر ڈالتی ہے۔

معیشت

ممالک اکثر غیرمناسب معاشی حکمت عملیوں اور ایسی حکمت عملیوں، جو کبھی قابل عمل رہی ہوں، کا انتخاب کرتے ہیں لیکن جو بعد میں بین الاقوامی ماحول میں تبدیلیوں کے نتیجے میں متروک ہوجاتی ہیں۔پاکستان بھی ایسے ہی ملکوں میں شامل ہے۔برطانیہ سے تعلیم یافتہ ایک ماہر سر آرتھر لیوس کی رہنمائی میں پاکستان نے ایک ایسی پالیسی اختیار کی جس میں معاشی پیداوار کو نجی شعبے میں تقسیم کرنے کے بجائے سرکاری شعبے میں رکھا گیا اور یہی ایک نکتہ ہے جس کی وجہ سے پاکستانی معاشی ماہر ڈاکٹر محبوب الحق جو اس پالیسی کے معماروں میں شامل تھے انہوں نے ایک تقریر کرتے ہوئے ''بائیس خاندان'' کی اصطلاح استعمال کی جو پاکستان معیشت پر چھائے ہوئے ہیں۔یہ پالیسی شروع میں کامیاب ہوئی اور اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں جگہ قابل زکر تعداد میں اپر اور مڈل کلاس کو جنم دیا۔اسکے نتیجے میں ایک موقع ایسا آیا جب پاکستان مڈل انکم سٹیٹس کے درجے کے قریب پہنچ گیا تھا۔

تاہم اس میں کچھ خامیاں تھیں۔پاکستان کی حکمت عملی میں زمین اور زراعت کو نظر انداز کیا گیا۔اس نے دیگر مشرقی ایشیائی ریاستوں اور بھارت کی طرح کبھی موثر قسم کی اراضی اصلاحات کے لیے کام نہیں کیا۔اس کے علاوہ معاوضوں کو کم رکھنے کی مسلسل پالیسی اپنائی

گئی۔ یونینز کو ہراساں کیا گیا اور بنیادی تعلیم میں سرمایہ کاری نہیں کی گئی۔ سرلیوس کے بقول کئی نسلوں کی گروتھ کے بعد پاکستان زیادہ تقسیم کاری اور شراکتی حکمت عملی کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔

گلوبلائزیشن کے پاکستان میں داخلے کے وقت تعلیم کی کمی اس ملک کے لیے معذور کردینے والا مسئلہ تھا۔ یہ ویلیو چین کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا2008-2007ء میں عالمی مسابقتی انڈیکس (جی سی آئی) پاکستان 92 نمبر تھا جو2010-2009ء میں مزید نیچے جاتے ہوئے101 نمبر پر پہنچ گیا اور عالمی اقتصادی فورم کی2010-11 کی نئی درجہ بندی میں یہ ٹوٹل 130 ملکوں میں 123 ویں نمبر پر آ رہا ہے۔ مسابقتی سپورٹ فنڈ (سی ایس ایف) کی ایک حالیہ اشاعت کے مطابق گذشتہ پانچ عشروں کے دوران پاکستان کی معاشی گروتھ صحت مند حد تک پانچ فیصد سالانہ رہی ہے تاہم ملک کی اشیاء اور سروسز یا اس کی تیارشدہ اشیاء کی ویلیوایڈیشن کے حوالے سے مسابقانہ پوزیشن کی صورتحال ایسی نہیں رہی۔ اس کے بجائے یہ خلیجی یا دیگر مسلم اور غیرمسلم ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی جانب سے بھیجے جانے والے پیسے پر ہی انحصار کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم پاکستانی انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں (سترہ کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ) اور ملک کی ٹیکس جی ڈی پی کی ریشو صرف نو فیصد ہے۔

جو گروتھ ہوئی اس کی سمت غلط رہی۔ اس سے امیروں کو فائدہ ہوا اور اس کے نتیجے میں پاکستان نے وسیع پیمانے پر سماجی اور معاشی سرمایہ کاری نہیں کی جو اسے گلوبلائزیشن کے حملے کے لیے تیار کرتی اور لوگوں اور معیشت کو اس نکتے پر منسلک کرتی جہاں پر کسی حد تک دنیا حقیقی معنوں میں بہت فلیٹ ہوتی ہے۔ پاکستان میں تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر خوشحال شہری آبادی اسی طرح رہتی ہے جس طرح اسی آمدنی کے حامل دوسرے ملکوں میں ان کے جیسے لوگ رہتے ہیں۔

2007-2005ء میں چوٹی پر پہنچنے کے بعد اکثر معاشی اشاریے ڈرامائی انداز میں نیچے کی طرف آنے لگے۔ جی ڈی پی گروتھ جو2005ء میں ریکارڈ7.7 فیصد تک پہنچ گئی تھی وہ2008ء میں نیچے آ کر106 فیصد کی مایوس کن حد تک آ گئی اور2011ء میں یہ صرف 2.6 فیصد پر ہے۔ گذشتہ دو عشروں کے دوران مستقل اضافے کے بعد معیشت آبادیاتی اضافے کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوگئی اور اس کے نتیجے میں2007ء کے بعد سے جی ڈی پی گروتھ فی کس

2400 ڈالر کے قریب آکر رک گئی۔اسی عرصے کے دوران آبادی پرایک اور بوجھ پڑا جو افراط زر کی صورت میں تھا جو آسمان کو چھوتے ہوئے2008ء میں بیس فیصد تک پہنچ گئی اور اگلے چند سالوں کے دوران اس کا تخمینہ دس فیصد سے کم ہونے کا نہیں۔پاکستان میں بیروزگاری اتنی کبھی نہیں ہوئی جتنی آج ہے جو کہ اب چودہ فیصد کے بیس سالہ ریکارڈ تک جا پہنچی ہے اور2013ء تک اس میں مزید اضافے کا امکان ہے۔لیبر اور پیداوار کے دیگر اشاریے2006ء کی شرح پر کھڑے ہیں اس لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ پاکستان بیرونی ذرائع پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔ان ورڈ براہ راست غیرملکی سرمایہ کاری 2007ء میں چوٹی پر پہنچتے ہوئے چھ ارب ڈالر ہوگئی اور اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں اس میں سالانہ دو ارب ڈالر کے حساب سے استحکام آئے گا۔برآمد کے مقابلے میں درآمد زیادہ ہونے کا رجحان بھی جاری ہے جس کے نتیجے میں کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ2009ء میں 2.2 فیصد سالانہ ہوگیا ہے۔مزید اہم یہ ہے کہ ملک کا غیرملکی امدادی اداروں پر انحصار بڑھ رہا ہے۔2005ء میں کشمیر میں آنے والے زلزلے اور2010ء کے سیلاب کے بعد بیرونی امداد بے مثال حد تک پہنچ چکی ہے یعنی سٹیٹ بینک کے مطابق ترقیاتی امداد کے سلسلے میں ملک کو 2009ء میں چار ارب ڈالر موصول ہوئے جس میں نصف سے زیادہ کثیرطرفہ اداروں اور ترقیاتی بینکوں کی طرف سے آیا۔

ورلڈ بینک میں بیٹھے بیوروکریٹس اور امریکہ، سعودی عرب، برطانیہ اور جاپان جیسے ڈونر ملکوں کے سفارت کاروں کے علاوہ یہ بیرون ملک میں مقیم پاکستانی تھے جنہوں نے اپنے ملک کی بیمار معیشت پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا:تارکین وطن پاکستانیوں نے مالی سال 2009-2010ء کے دوران8.9 ارب ڈالر کا زرمبادلہ بھیجا جس کا مطلب تھا کہ2001ء کے بعد سے اس میں چارگنا اضافہ ہوا۔

اس کمزور اور غیریقینی گروتھ کے سماجی نتائج بہت سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔جیسا کہ انیتا ولیس کا کہنا ہے کہ پاکستان کے غریب اور دیہاتی لوگوں کے پاس بہت محدود ذرائع باقی بچے ہیں جو کہ روزگار اور اپنے بچوں کے لیے بہتر سکولوں کی تلاش میں ہیں اور افراط زر کا شکار ہوکر عملی طور پر تاریکی میں زندگی گذار رہے ہیں۔یواین ڈی پی کے انسانی ترقیاتی انڈیکس میں پاکستان کی درجہ بندی1991ء میں120ء سے کم ہوکر2002ء میں138 اور

2009ء میں 141 ہوگئی ہے جو کہ کانگو اور میانمار سے بھی خراب صورتحال ہے اور محض سوازی لینڈ اور انگولا جیسے ملکوں سے بہتر ہے اور یہ وہ تمام ملک ہیں جن کی معیشت پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور ہے۔

اب جبکہ پاکستان، جہاں زیادہ تر لوگ انتہائی گنجان آباد شہروں میں رہتے ہیں، میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ چکی ہے جو اشیاء اور خدمات کا طلب گار ہیں، انیتا ویس اور پاکستان کا مطالعہ کرنے والے دیگر طالب علموں کا کہنا ہے کہ حکومت کو صرف امیروں کے لیے نہیں بلکہ عام آبادی کے لیے زیادہ معاشی جگہ پیدا کرنا ہوگی اور معاشی اور سیاسی انصاف کو ترجیح دینا ہوگی۔ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ چکی ہے جو کہ اس بات کو جان چکے ہیں کہ تعلیم کے اعلیٰ معیار اور میڈیا کوریج کے پھیلاؤ کی وجہ سے دنیا کس قدر آگے جا چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فطری طور پر وہ بھی زیادہ کی امید رکھتے اور اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔اب اگر چند مثبت عناصر اور زیادہ تر منفی عناصر کو ماپتے ہوئے توازن کی طرف دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ پاکستان اپنے گروتھ ریٹ میں اضافہ کر سکے گا یا آمدن کی موجودہ خراب تقسیم کاری کو تبدیل کر سکے گا یا سیاسی طبقے کی جانب سے ٹیکسوں کی زیادہ شرح کی حمایت کی جائے گی۔ اسی طرح بیرونی امداد بشمول کیری لوگر امداد سے کوئی زیادہ فرق پڑے گا۔

پاکستان اب اپنی آمدنی پر بہت مشکل سے چل رہا ہے اور اکثر سوشل سروسز کے لیے ادائیگی غیر ممالک کی جانب سے ہورہی ہے۔اگر امداد روک دی جاتی ہے تو حکومت کو ایک بار پھر معاشی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ایسا 2001ء میں ہوا تھا اور یہ صرف امریکہ تھا جو نائن الیون کے بعد اس دیوالیہ ملک کو بچانے کے لیے آگے آیا تھا۔پاکستانی لیڈر اور غیر ملکی ڈونر دونوں یہ جانتے ہیں کہ اگر پاکستان کے موجود ٹیکس سٹرکچر اور کمزور برآمد صلاحیت کو دیکھا جائے تو پاکستان غیر معینہ مدت تک غیر ملکی امداد کا محتاج رہے گا۔

کئی لحاظ سے پاکستان سابق مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش کی طرح بن رہا ہے تاہم اپنے اہم محل وقوع، ایٹمی صلاحیت اور افغانستان میں مغرب اور کشمیر میں بھارت کو چیلنج کرنے کے لیے آمادگی کی وجہ سے یہ ذرا مختلف نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

پاکستان اپنے عوام کو بنیادی خدمات فراہم نہیں کر سکتا۔ ماضی میں پاکستان ایسا کر سکتا تھا

کیونکہ اس وقت اس نے جس قسم کی معاشی حکمت عملی اختیار کی تھی اس کے لیے پڑھی لکھی ابادی کی ضرورت نہیں تھی لیکن آج کے دور میں ایک پڑھی لکھی آبادی تیل اور معدنی دولت، جو پاکستان کے پاس ویسے ہی بہت کم ہیں، سے بڑا اثاثہ بن سکتی ہے۔ یہ ہائی ویلیو اشیاء برآمد کرنے والا ملک نہیں ہے اور صرف کمتر سطح کی خدمات ہی فراہم کرتا ہے (یعنی غیر ہنر مند کارکنوں اور پیشہ وارانہ ماہرین کو بیرون ملک بھیجنے کی صورت میں) اور ملک کے زرعی شعبے کو جدید بنانے کا موقع یہ کئی سال پہلے ضائع کر چکا ہے۔ ایمانداری کی بات ہے کہ پاکستان کے دوستوں اور حامیوں بالخصوص امریکہ اور چین نے پاکستان میں ماڈرن انڈسٹری کی تیاری کے سلسلے میں اس کی کوئی مدد کی اور نہ ہی اس کو ٹیرف کی پابندیوں سے آزاد کر کے اپنی اشیاء اور خدمات، بالخصوص ٹیکسٹائل، کی برآمد کرنے کی اجازت دی۔

پاکستانی معیشت کی ایک بڑی خصوصیت بجٹ کے بڑے حصے کا دفاعی اخراجات پر خرچ کرنا شامل ہے۔ پاکستان نے افراط زر کے ساتھ چلنے اور خیبر پختون خواہ میں جاری جنگ کے سلسلے میں فوجیوں اور لڑائی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دفاعی بجٹ میں 2010-2011ء کے دوران لگ بھگ سترہ فیصد کا اضافہ کیا جس کے بعد یہ کل 5.17 ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔ سیکیورٹی پالیسیوں کے حوالے سے ایک ممتاز تجزیہ کار ریٹائرڈ جنرل طلعت مسعود کا کہنا ہے کہ مشرقی سرحد پر پاکستان کے دفاعی اخراجات مستحکم ہیں اور جو نیا اضافہ کیا گیا ہے وہ براہ راست ملک میں جاری عسکریت پسندی یا دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے ہے۔ 2001ء سے پاکستان امریکہ سے بھی پندرہ ارب ڈالر کی براہ راست پے منٹ لے چکا ہے جس کا دوتہائی سلامتی کے معاملات سے متعلق ہے۔

وسط نوے کی دہائی سے جنرل جہانگیر کرامت سے لیکر ان کے بعد کے پاکستانی آرمی چیفس اس بات سے آگاہ ہیں کہ پاکستان کی کمزور معیشت اس قابل نہیں کہ فوجیوں کے معیار کو اعلیٰ سطح پر برقرار رکھا جائے، بھارت کے مقابلے کے لیے فوج کو تیار رکھا جائے اور مطلوبہ تعداد میں جدید آلات خریدے جا سکیں۔ اگرچہ اس قسم کی باتیں کثرت سے کی جاتی ہیں کہ پاکستان کسی بھی قسم کی فوجی مہم جوئی کا مقابلہ کر سکتا ہے اور یہ کہ بھارت سے جنگ کی صورت میں ناقص ہتھیاروں کی کسر پاکستانی جرات اور بہادری اور مہارت کے ذریعے پوری کر لی جائے گی تاہم تمام حالیہ آرمی چیفس کو بجٹ کے مسائل کا سامنا رہا ہے اور ان میں

سے کچھ نے تو بھارت کے ساتھ مذاکرات کی بھی حمایت کی۔ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں پاکستان کی پیش قدمی اور شمال مغربی سرحد میں لڑائی کے لیے نئی ضروریات اور دفاعی اخراجات کے حوالے سے شفافیت کی عدم موجودگی، کہ اس سلسلے میں کھلے عام بحث کی اجازت نہیں، کے باعث بھی بجٹ کے مسائل مزید پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

اس مجموعے میں پیش کردہ عوامل سے قطع نظر یہ دکھائی دیتا ہے کہ پالیسی سازوں کے لیے پاکستان کی معیشت کو تشکیل دینا مشکل نہیں کیونکہ ماضی میں یہ ملک گروتھ کی بلند شرح کا مظاہرہ کر چکا ہے۔شاید اب ایسا ممکن نہ ہو کیونکہ عالمی اکانومی کے تیزی سے عالمگیریت کی طرف بڑھنے کے موقع پر پاکستان کو جتنے بھی مواقع ملے وہ یہ ضائع کر چکا ہے۔مہارت اور تعلیم کے شعبے میں اس کی کوئی تیاری نہیں تھی، اس کا ملکی سیاسی صورتحال بھی غیر مستحکم تھی اور قدرتی زرائع بہت کم تھے۔فی کس آمدنی کے اعتبار سے پاکستان پہلے ہی بنگلہ دیش اور بھارت سے پیچھے جا چکا ہے اور یہ فرق مزید بڑھنے کا امکان ہے۔

2# پاکستان کا تشخص

بنیادی طور پر قومیں ایک نظریہ ہوتی ہیں اور پاکستان کا نظریہ 1930ء کی دہائی میں سامنے آنے کے بعد سے لیکر اب تک تبدیلی سے دوچار ہے۔ہم یہاں پاکستان کے تشخص یا شناخت کے تین عوامل کا ذکر کرتے ہیں : اول پاکستان کے مطلب اور یہ کہ پاکستانی کا مطلب کیا ہے اس کے حوالے جاری مسلسل بحث، دوئم، اس شناخت کو اسلام کے ساتھ ملانے کے لیے درپیش خصوصی مشکلات، سوئم، نظریہ پاکستان کو درپیش علاقائی اور نیم قومی چیلنجز وغیرہ۔

نظریہ پاکستان پر جاری مسلسل بحث

پاکستان کے حوالے سے مختلف نظریات پیش کیے جاتے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ، فوج، نسلی و لسانی گروہوں، مختلف اسلامی گروہوں (خاص طور پر اسلام کے اندر پائے جانے والے مختلف فرقہ ورانہ تنازعات کے حوالے سے) اور مختلف اقلیتوں کی جانب سے (جو سیکولر ریاست کی حامی ہیں) نظریہ پاکستان کے حوالے سے آراء مختلف ہیں۔پرانے حلقوں کی جانب سے ایک نیا چیلنج سامنے آیا ہے: پاکستانیوں کے درمیان طبقاتی آگاہی اور اختلاف

میں اضافہ، جو کہ ایک ایسی پیش رفت ہے جسے اسلامی اور سیکولر دونوں قسم کے گروپ اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش میں ہیں۔کئی صورتوں میں اسلامی تحریکیں طبقاتی انقلابی تحریک سے ملتی جلتی ہیں۔ سیکولرازم کی پرز ور حامی جماعت ایم کیوایم جو اب مہاجرقومی موومنٹ کے بجائے متحدہ قومی موومنٹ کہلاتی ہے جو اب سندھ اور کراچی کے اپنے شہری مرکز سے نکل کر پنجاب اور دیگر علاقوں میں آ رہی ہے اور پاکستانی مڈل کلاس کی حمایت حاصل کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے لیے چیلنج پیش کر رہی ہے۔ پہلے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ستر سالہ پرانی وہ بحث جاری ہے کہ پاکستانی کا مطلب کیا ہے اور آیا کہ نئے مطالب اس چیز کو خارج کر دیں گے جو کہ قومی تشخص اور یک جہتی کی باقیات ہے اور اس کے بعد ہم ان شناختی ایشوز کی جانب رخ کریں گے جو کہ جناح کے نظریہ پاکستان کے لیے نسلی ولسانی اور فرقہ وارانہ چیلنجز سے پھوٹتے ہیں۔

اگرچہ اس کی پیمائش مشکل ہے تاہم کم ازکم پاکستان کی اشرافیہ میں یہ بحث بہت بڑھ چکی ہے کہ پاکستان کے مقاصد اور معنی کیا ہیں جس کی وجہ بڑے پیمانے پر پایا جانے والا یہ احساس ہے کہ معاملات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ یہ چیز پاکستان کی نوجوان نسل میں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو دیگر ایشیائی ریاستوں کی طرح رجائیت پسندی کا احساس نہیں رکھتی۔ انگریزی اخبارات کے صفحات اس قسم کی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں جن میں عدم رواداری، تعصب حتیٰ کہ نسل پرستی اور مذہبی اقلیتوں، غیرملکیوں اور لسانی اجنبیوں کے ساتھ تشدد آمیز سلوک پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہوتا ہے۔ پاکستانی قبائلیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور میڈیا اس عمل کو تیز کر رہا ہے۔ پاکستان کا تواتر سے دورہ کرنے والے غیرملکیوں، چاہے وہ مغربی ہوں یا ایشیائی، ان کا کہنا ہے کہ 1960ء کا پرسکون عشرہ تو دور کی بات، یہ 1970ء کی دہائی جیسا پاکستان بھی نہیں ہے۔

کیا عدم اطمینانی کی اس صورت حال کے ساتھ پاکستان چلتا رہے گا؟ ایسا ہوسکتا ہے تاہم اس سے مستقبل بعید میں کسی دھماکے کی مزید وجوہات پیدا ہوں گی۔ نئی نارمل صورت حال ابنارمل ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ پاکستان کے مقصد اور معنی کے حوالے سے اختلافات میں مزید اضافہ ہوگا۔

نسلی ولسانی عزائم

نسلی اختلافات کے باعث پاکستان کی ایک اور تقسیم کے حوالے سے رپورٹوں کو آئندہ پانچ سالوں تک کے لیے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا جارہا۔ پاکستان ایک بہت متنوع ملک ہے جس میں کئی قسم کے گروپ ہیں اور جن میں سے کچھ خود کو ''قوم'' کہتے ہیں اور ان کی اپنی الگ زبان، ثقافت اور شناخت ہے۔ کچھ سروے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ پاکستانی پہلے خود کو پاکستانی اور بعد میں پنجابی، بلوچ، سندھی یا مہاجر کہتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ پیوگلوبل افیئر پراجیکٹ یہ کہتا ہے کہ سندھی لوگ سندھی ہونے کے مقابلے میں پاکستانی ہونے کا قابل ذکر حد تک کم احساس رکھتے ہیں۔ تاہم پاکستان میں اس قسم کے نازک مسائل پر کیے جانے والے سروے مشکوک ہوتے ہیں۔ سروے چاہے کچھ بھی کہتے ہوں، تشخص کے بارے میں تنازعات کے حوالے سے طاقت اور منظم گروہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

اگرچہ پاکستانی کے لسانی گروہ کسی طور پر بھی قابل مسابقت نہیں تاہم سوائے پنجابیوں کے تمام کو مرکزی حکومت کی جانب سے غیض وغضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ ان میں علیحدگی یا خودمختاری کے لیے تحریکیں چلتی رہتی ہیں۔ بلوچ ایک قبائلی معاشرہ ہے جبکہ سندھی غالب حد تک دیہاتی ہیں اور مہاجر غالب حد تک شہروں میں رہتے ہیں جبکہ بے گھر سندھیوں کی ایک بڑی تعداد بھی کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں رہتی ہے۔ اب تک فوج صرف ان ہی گروہوں کے خلاف استعمال ہوتی رہی ہے تاہم 2009ء کے بعد فوج کے جنوبی وزیرستان اور خیبر پختونخواہ کے دیگر علاقوں میں جانے کے بعد پختون بھی فوج کے خلاف ہو چکے ہیں۔

نسلی شعور میں اضافے اور اسلام آباد کی موجودہ مرکزی حکومت کی جانب سے زیادہ مصالحتی رویہ اختیار کیے جانے کے بعد امید ہے کہ پاکستان میں ایک نیا توازن برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ طاقت کے صوبائی مراکز کے بتدریج ابھرنے سے بھی سیاست کو پہلے ہی نئے چیلنجز کا سامنا ہے جس کو سول سوسائٹی کی بھرپور حمایت حاصل ہے اور جو نئے ماس میڈیا کی وجہ سے خاصی آواز رکھتی ہے۔ 2010ء میں انیس سال کی بحث کے بعد قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ کی منظوری دی گئی۔ اس قانون کے تحت محصولات اور وسائل کے استعمال میں صوبوں

کے لیے زیادہ اضافہ کیا گیا ۔ اختیار کی نئے سرے سے اس تنظیم کے نتائج طویل المعیاد تھے۔اس ایوارڈ کے تحت محصولات میں شئیر کے نئے قانون سے وفاقی یونٹوں کو زیادہ حصہ دینے کے وعدے سے ملک دوبارہ اپنے حقیقی وفاقی ڈھانچے کی طرف مڑ گیا۔صرف اس پیش رفت سے مرکز گریز قوتوں کی حوصلہ شکنی کی گئی جو طویل عرصے سے ریاست کے لیے خطرہ بنی رہی تھیں۔تاہم سوائے پنجاب کے کم ہی صوبے اتنی انتظامی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان نئے اختیارات اور ذمہ داریوں کا فائدہ اٹھاسکیں۔

اگر موجودہ چار صوبوں سے مزید نئے صوبے نکالے جاتے ہیں تو اس سے نظریاتی طور توازن پیدا کرنے والی مزید قوتوں کے ابھرنے کا امکان پیدا ہوگا۔اسکے نتیجے میں پنجاب کی بے پناہ طاقت کم ہوگی جہاں ملک کی ساٹھ فیصد آبادی رہتی ہے اور سیاسی نظام میں اس کا اکثریتی حصہ ہے۔ قومی اسمبلی کی صوبوں کے مخصوص کل 272 نشستوں میں سے 148 اس کے پاس ہیں جو کہ 54 فیصد بنتا ہے۔پنجابی جو کہ ملکی آبادی کا چوالیس فیصد ہیں اور وہ ملک کا سب سے بڑا نسلی گروہ ہیں جسے ملک کے مختلف اشاریوں میں زائد نمائندگی نہیں تو کم از کم مرکزی حیثیت ضرور حاصل ہے۔ بیوروکریسی میں ان کی نمائندگی 51 فیصد ہے اور آفیسر کیڈر کے ستر فیصد ریٹائرڈ لوگ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنجاب کی اس غیر متناسب طاقت کو دیکھتے ہوئے اس بات کا امکان کم ہے کہ آئندہ پانچ سالوں کے دوران کوئی بڑی آئنی ایڈجسٹمنٹ کی جائے گی اور یقینی طور پر اس کی توثیق فوج کی جانب سے ہی ہوگی۔

بیلاجیو ورکشاپ کے ایک شریک کار جوش وائٹ کا کہنا ہے کہ ریاست علیحدگی پسند قوتوں کو روک سکتی ہے۔اس سلسلے میں1971ء کے واقعے کو استثنٰی سمجھا جائے جب ملک کی اشرافیہ اپنی اس صلاحیت کے حوالے سے غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی کہ وہ بنگالیوں کی بغاوت کو کچل دے گی اور اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ بھارت اس میں فوجی مداخلت کرے گا تاہم ماضی میں پاکستان کی قیادت قوم پرستوں اور علیحدگی پسندوں کو روکتی رہی ہے اوراس میں بعض اوقات سختی کا بھی مظاہرہ کیا گیا۔پشتون قوم پرستی نے شروع میں کچھ مشکل پیدا کی لیکن وہ کبھی بھی ریاست کے لیے زیادہ بڑا تزویراتی خطرہ نہیں بن سکی۔بلوچ بھی فوج کے لیے کانٹے کی طرح رہے تاہم رشوت اور جبر کے ذریعے ان کی طاقت کو کم کردیا گیا۔سرائیکی صوبے کی تحریک نے بھی زیادہ زور نہیں پکڑا۔اس کے علاوہ کمزور ق لیگ کے اتحادی ہزارہ صوبے کے

حامیوں کے پاس بھی زیادہ سیاسی قوت موجود نہیں۔

اگرچہ نسلی لسانی قوم پرستوں کی ان مثالوں کی جانب سے ریاست کو خطرے کا امکان کم ہے تاہم وہ حکومت اور فوج کی جائز حیثیت کے لیے نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ کسی حد تک یہ بھی ممکن ہے کہ پشتون قوم پرستی دوبارہ زندہ ہوجائے اور وہ بھی سیکولر عوامی نیشنل پارٹی کی صورت میں بائیں جانب سے نہیں بلکہ ایسا دائیں بازو کی جانب سے ہوسکتا ہے جو کہ اس سلسلے میں نئے پاکستانی طالبان گروپوں کو استعمال کرسکتے ہیں۔ سب سے زیادہ طاقت ور تحریکیں وہ ہوتی ہیں جن میں نسل اور مذہب اکٹھے ہوں اور پاکستانیوں کے لیے یہ چیز دہشت ناک ہے کہ مذہب جوش اور علاقائی دعوے اور لسانی اور ثقافتی اشتراک کے ساتھ پشتونوں کی نئی طالبان تحریک کی صورت میں ابھر سکتی ہے اور اس کے لیے ملک بھر بالخصوص کراچی کے پشتونوں کی اسے بھرپور مدد حاصل ہوسکتی ہے۔

پاکستانی طالبان پشتونوں کی محرومیوں اور شکایات کے لیے اظہار کا ایک نیا ذریعہ بن کر ابھرے ہیں تاہم وہ اس سلسلے میں نسل پرستی کے بجائے مذہب کو استعمال کررہے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ نسل کے بجائے مذہب کے ذریعے لوگوں کو حرکت میں لانا زیادہ موثر ہے یا شاید اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انہیں زیادہ تر امداد کشمیر کے پنجابیوں یا فرقہ وارانہ تنظیموں کی طرف سے ملتی ہے۔

اگر پاکستانی اور امریکی فوج اپنی کارروائی کا دائرہ آنے والے سالوں میں خیبر پختون خواہ میں مزید پھیلاتی ہیں تو طالبان گروہ مقامی ناراضگی اور عدم اطمینان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستانی حکومت کے خلاف اپنی مزاحمت کے لیے مذہب اور نسل کے مجموعے کو استعمال کرسکتے ہیں۔ اس سے ضروری نہیں کہ پاکستانی ریاست تقسیم ہوجائے تاہم اس کا نتیجہ ان کی جانب سے حکومت کے خلاف گہری دشمنی اور خیبر پختون خواہ، فاٹا اور بلوچستان میں مختلف علاقوں کے طالبان کے کنٹرول میں جانے کی صورت میں برآمد ہوسکتا ہے۔

پنجاب پاکستان کا واحد صوبہ ہے جہاں داخلی سلامتی کی وجوہات کی بنا پر ابھی تک بڑے پیمانے پر فوج کو تعینات نہیں کیا گیا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں پر فوج کی زیادہ تر یونٹوں کی سرگرمیاں بھارت کے خلاف دفاع کے سلسلے میں مصروف ہوتی ہیں۔ پنجاب میں سیکورٹی کی صورتحال خاص طور پر اس لیے بھی نازک ہے کیونکہ یہ صوبہ فوج کا قلب اور

ملک کی بڑی آبادی کا مرکز ہونے کے علاوہ شدید ترین فرقہ وارانہ تشدد کا علاقہ بھی ہے۔ یہاں پر دہشت گردی کے کئی بڑے حملے بھی ہو چکے ہیں جن میں2009ء میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملے کے علاوہ ریاست کے کئی اہم اداروں بشمول نیول سکول، پولیس ٹریننگ سنٹر اور آئی ایس آئی اور دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے دفاتر کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاچکا ہے۔ پولیس کی حالت ٹھیک نہیں جبکہ فوج مداخلت کرنے سے گریزاں ہے اور اس نے بھی سیاست دانوں کی طرح پنجاب کے بڑے شہروں بشمول لاہور میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ جب اس سلسلے میں عالمی میڈیا میں خبریں شائع ہوئیں تو حکومت اور فوج دونوں کا ردعمل نیویارک ٹائمز پر اس الزام کی صورت میں سامنے آیا کہ یہ اور دیگر اخبارات اصل میں انٹی پاکستان ہیں اور یہ کہ اس میں بھارت یا دیگر غیر ملکی ہاتھ ملوث ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے کچھ خبریں پنجاب کے پولیس افسروں نے غیر ملکی میڈیا کو فراہم کی تھیں جنہیں دہشت گردی کے خلاف فوج تو دور کی بات صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی جانب سے بھی مدد نہیں مل رہی تھی۔

بنیاد پرست اسلام پسند اور فرقہ واریت

پاکستان خالصتاً اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا اس لیے اسلام اور اسلام کی شکایات اور محرومیاں جیسے فلسطین اسرائیل کا مسئلہ ہمیشہ سے پاکستان کی سیاست کا حصہ رہے ہیں۔ تاہم تین واقعات ایسے ہیں جن کی وجہ سے پاکستان میں اسلامی عسکریت پسندی میں اضافہ ہوا۔ اس میں پہلا واقعہ ایرانی انقلاب تھا جو کہ سنیوں اور شیعوں دونوں کے لیے مثال کی طرح تھا۔ دوسرا واقعہ یا عنصر پاکستانی فوج کی جانب سے اندرون ملک اور بیرون ملک بنیاد پرست اسلام پسندوں کے لیے امداد میں اضافے کی صورت میں تھا۔ تیسرا واقعہ گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد امریکہ اور مغرب کا ردعمل اور اس کے نتیجے میں عراق اور افغانستان پر حملہ تھا۔

ان پیش رفتوں کے باعث ریاست اور اسلام کے درمیان ایک پیچیدہ اور خطرناک تعلق قائم ہوگیا جس کو قابو کرنا آسان نہیں تھا۔ تقسیم برصغیر کے بعد پاکستان ایک ایسا خطہ تھا جو بھارتی ہندوؤں کے جبر سے فرار ہونے والے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ تھا جو اب تک اس فیصلے پر نہیں پہنچ سکا کہ اسلام کا ریاست میں کیا کردار ہوگا اور یہ سوال تو سرے

سے تھا ہی نہیں کہ اسلام کا پاکستان میں کردار ہے اور ہوگا اور بہت کم پاکستانیوں نے سیکولر پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ پاکستان اپنے اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے اپنی فطری طاقت کو پورے وسطی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا کے لیے پیش کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اسے ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کا بھی تحفظ کرنا ہے۔ کئی مبصرین کا کہنا ہے کہ پاکستان نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسلامی پراکسی جنگوں پر انحصار کیا اور اس سلسلے میں اس نے 1947ء میں کشمیر اور 1960ء کے عشرے میں افغانستان کو اپنی پراکسی جنگوں کا ہدف بنایا۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ پاکستانیوں کی اکثریت مسلمان ہے اور مذہب پر پورا یقین رکھتی ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اس مذہبی یقین کو ریاست بالخصوص فوج کی جانب سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ایسے گروہوں کی حمایت اور اعانت کرتی ہے جو کہ اس کے موقف سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور عسکریت پسندوں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ وہ پاکستان کے قومی مفاد کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بغاوت کو کچلنے کی کوشش میں یہ حکمت عملی قابل ذکر تھی تاہم حسین حقانی کا دعویٰ تھا کہ ریاستی مقاصد کے لیے اسلامی بنیاد پرستوں کو استعمال کرنے کا رجحان بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ جو لوگ اس حکمت عملی کی حمایت کرتے ہیں ان کی طرف سے اسے پاکستان کے اسلامی مزاج کے قانونی اظہار کے طور پر نہیں دیکھا جاتا جو امریکہ اور یورپ کے اس رویے سے ملتا جلتا ہے جو کہ وہ دنیا بھر میں جمہوریت کی حمایت کی صورت میں رکھتے ہیں۔ لہٰذا مقامی اور غیر ملکی سیاست میں اسلام پسندوں کی حمایت ایک ادارہ جاتی ذمہ داری ہے دہشت گردی کا فعل نہیں۔

اسلام یا مذہب اصل میں کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کی طرف سے مذہب کو کس طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جن بوتل سے نکل چکا ہے اور اب پاکستان کے مستقبل کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ اسے دوبارہ کس طرح بوتل میں بند کیا جاتا ہے۔ حالات سے بہت زیادہ مایوس پاکستانی سمجھتے ہیں کہ جنگ ہاری جا چکی ہے اور ان میں سے کچھ کہیں اور پناہ لے چکے ہیں۔ پاکستان ملائیت سے بہت دور ہے کیونکہ اسلام پسند تو خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے درپے ہیں اور یوں پاکستان کو کسی اور ہی قسم کی خانہ جنگی کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ یعنی ایک ایسی جنگ جس میں مذہب

اور عقائد اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ آپ کس کی طرف ہیں۔

کیا نفاذ اسلام یا اسلامائزیشن کا دھیرے دھیرے بڑھتا ہوا عمل ناقابل واپسی ہے؟ پاکستانی باشندے اسلامی نعروں سے لبریز ہیں۔ یہ ملک ہمیشہ سے مذہبی ملک رہا ہے اور اس وقت پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دیگر دنیا میں بڑھنے والی مذہبیت کی طرح ہی ہے جس میں نہ صرف مسلم ممالک بلکہ اسرائیل جیسا ملک بھی شامل ہے جو کہ مذہب کی بنیاد پر بننے والا دنیا میں دوسرا ملک ہے جبکہ یورپ سے باہر امریکہ، لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا بھی اس میں شامل ہیں۔

مذہب اور سیاست کا امتزاج بہت طاقتور ہوتا ہے لیکن پاکستان کے کچھ لبرل عناصر جو کہ ملک میں بڑھتی ہوئی اسلامائزیشن سے پریشان ہیں اس بات کی امید بھی رکھتے ہیں کہ یہ رجحان ختم ہوسکتا ہے۔ ملک کے ممتاز ترین سائنسدان اور تجزیہ کار پرویز ہودبھائی اپنی ایک بڑی پیمانے پر تقسیم کی جانے والی دستاویز کے آخر میں لکھتے ہیں:

”میں اپنے اس کسی حد تک اس تلخ مضمون کا اختتام ان امید افزاء الفاظ سے کروں گا: عقل ناپسندی کی قوتیں آخر کار خود کو ختم کرلیں گی کیونکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک بے سوچی سمجھی سمت میں جاتا ہے جبکہ استدلال اور عقل کی سمت ایک ہی ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عقل و استدلال ہمیشہ عقل ناپسندی پر فتح پائے گی اور انسانوں کا اس سمت میں ارتقاء جاری رہے گا جس میں وہ اعلیٰ اور بہتر مخلوق میں ڈھل جائیں گے۔ آخر کار اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی کہ ہم پاکستانی ہیں، بھارتی یا کشمیری یا کچھ اور۔ ان راستوں، جن پر ہم ابھی غور نہیں کر رہے، چل کر لوگ اپنے قدیم زمانوں کے علاقائیت، قبائلیت، مذہب اور قوم پرستی پر مبنی تعصّبات پر قابو پالیں گے۔ لیکن فی الحال یہ محض ایک مفروضہ ہے۔“

ایک سیکولر، اعتدال پسند اور جمہوری پاکستان کے تصور کو نسلی گروہوں اور مذہبی انتہاپسندوں کی جانب سے حملے کا سامنا ہے اور جناح کا تصور پاکستان ابھی بڑے پیمانے پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ نسلی رواداری رکھنے والے ایک کم یا زیادہ سیکولر پاکستان کا تصور شاید ابھی

MashalBooks.org

ناقابل عمل ہو۔ جب تک کہ صحیح معنوں میں مکمل قول وفعل کے ساتھ تصور پاکستان کی حمایت میں حکومت کی جانب سے بنیادی تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں اس وقت ریاست کی اخلاقی اتھارٹی خطرے میں رہے گی اور پاکستان کے مقاصد کے حوالے سے ایک اختلافی بحث بڑھتی رہے گی۔

3۔ریاستی ربط

اگر قومیں نظریہ ہیں تو ریاستیں بیوروکریسی ہیں۔پاکستان میں ایک مخصوص افسر شاہی تنظیم (فوج) کا غلبہ ہے جو نہ تو خود پاکستان کو موثر طریقے سے چلا پاتی ہے اور نہ دوسروں کو چلانے دیتی ہے۔اسی عرصے کے دوران گذشتہ ساٹھ سال میں پاکستانی ریاست کی صلاحیت ماند پڑ چکی ہے۔اس بات کا ثبوت ہمیں پاکستانی ریاست اور اس کے دیگر اداروں جیسے سیاسی پارٹیوں، بیوروکریسی حتیٰ کہ عدلیہ کی ہم آہنگی اور اہلیت کا دیگر ریاستوں کے انہی اداروں سے تقابل کرنے سے مل جاتا ہے۔فوج کے ناموزوں کردار اور سیاستدانوں اور اشرافیہ کی جانب سے ہر وقت اس کی ماتحتی میں کام کرنے کے لیے آمادگی بلکہ شوق سے زیادہ جو چیز پاکستان کے خلاف کام کرتی ہے وہ اس کا جغرافیہ اور گلوبلائزیشن کے منفی نتائج ہیں۔

قیادت اور سیاسی جماعتیں

پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں جمہوری عمل اور مفادات کو مجتمع کرنے کی صلاحیت دونوں کا فقدان ہے بلکہ ان میں سے اکثر افراد اور تنگ نظر سماجی طبقات کا آلہ کار ہیں۔حتیٰ کہ سب سے بڑی اور کھلی پارٹیوں کے خود اپنے اندر انتخابات کا رجحان موجود نہیں۔بینظیر کی موت سے پہلے جب میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو ان کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی اندرونی جمہوریت کے لیے تیار نہیں اور اسے ایک طاقتور قیادت کی ضرورت ہے جو کہ اسکے مختلف دھڑوں کو آپس میں ملائے رکھے اور ایک ایسی حکمت عملی تیار کر سکے جس سے پارٹی کو ریاستی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے حملے سے محفوظ رکھا جا سکے۔اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔دیگر شہری جماعتوں بشمول ایم کیو ایم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خاندانوں یا قبیلوں کے بجائے زیادہ تر مڈل کلاس کو اپیل کرتی ہے۔تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ ایم کیو ایم

بھی مہاجرازم اور شمالی اور وسطی بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے آباؤ اجداد میں شدید نسلی بنیاد رکھتی ہے۔

پاکستان کا سیاسی پیٹرن ایک کمزور اور غیر مستحکم جمہوری حکومتوں اور فوج کی قیادت میں ایک بی نائن اتھاری ٹیرین ازم میں گردش کرتا رہا ہے۔ یہ عوامل مزید اگلے پانچ سالوں تک پاکستان کے مستقبل کو متعین کرتے رہیں گے۔ موجودہ جمہوری حکومت مقبول نہیں لیکن اس کا خلاء پر کرنے کے لیے نہ تو ایک اور فوجی قیادت اور نہ ہی سویلین آمر کی شکل میں کوئی متبادل موجود ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں ایسے سیاسی کردار سامنے آتے رہے ہیں جو ایک ترقی پسند پاکستان کی تشکیل کے لیے عوام کو متاثر کرنے اور اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے تاہم یہ سب آخر کار عوام کے اعتماد سے محروم ہوتے رہے۔ 1970ء کی دہائی میں ایک ایسا وقت آیا تھا جب ذوالفقار علی بھٹو نے ملک میں سیاسی مکالمے کو تبدیل کر دیا تھا اور سیاست کو نئے زاویے دیے تھے۔ 1988ء کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے باری باری مقبول سیاسی مینڈیٹ کے ذریعے جمہوری سیاست کی مخصوص روایت کو توڑا۔ عہدہ صدارت کی شکل میں حالات کو بدلنے اور نئی سیاسی قیادت لانے کی امید میں جنرل مشرف کو بھی ابتداء میں خوش آمدید کہا گیا۔

بیلاگیو ورکشاپ کے کچھ شرکاء کی جانب سے پاکستان کے سیاسی نظام میں ٹرانسفارمیشن کے امکان کو مکمل طور پر رد نہیں کیا گیا 2007-2008ء کی وکلاء تحریک جس کا نصب العین ایک آزاد عدلیہ اور جمہوری نظام تھا اس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ سیاسی طور پر غیر متحرک آبادی کو سیاست کے لیے کس طرح حرکت میں لایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عدلیہ کے حالیہ متحرک کردار اور پارلیمانی نظام بحال کرنے والی آئینی تبدیلیوں کے نتیجے میں اداروں کے درمیان چیک اینڈ بیلنس پر مشتمل ایک نظام لانے کی امید بھی پیدا ہوگئی ہے۔ کچھ مبصرین ان پیش رفتوں کو ایک ترقی پسند جمہوری منظرنامے کی جانب اٹھنے والے قدموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ دیگر کا کہنا ہے کہ فوج یا کسی آمرانہ پارٹی لیڈر کے ساتھ مل کر ایک سخت گیر اور مصالحانہ کردار ادا کرنیوالی عدلیہ جبر کے ایک طاقتور آلے میں بدل سکتی ہے۔

سماجی تحفظ کے نیٹ ورک کی غیر موجودگی میں طبقاتی تفاوت اور عدم مساوات کے باعث پاکستان ان خصوصی اجزاء سے محروم ہے جو کہ سیاسی اور سماجی بہتری کے لیے ضروری

ہیں۔ پاکستان کے عوام ان شکوک وشبہات کا پورا حق رکھتے ہیں جو کہ انہیں اپنی فلاح و بہبود کے حوالے سے کام کرنے کے بارے میں سویلین یا فوجی قیادت کی حامل حکومتوں پر ہیں۔ تاہم پاکستان کی ٹرانسفارمیشن کے حوالے سے جو متبادل منظر نامے ہیں ان میں بھی کئی مسائل ہیں۔ مارون وین بام کے بقول اس سلسلے میں بہترین وضاحتوں میں قیادت اور پروگرامیٹک پارٹیوں کی جانب سے سیاسی اخراج کا نہ ہونا ہے اور اس کے علاوہ ایک ایسی توانا سول سوسائٹی کی غیر موجودگی ہے جو کہ ایک مقبول تحریک پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

آزاد پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا تک رسائی کے ساتھ ایک موثر قیادت لوگوں کی اس فرسٹریشن کو قابو میں کرسکتی ہے جو کہ ان میں توانائی اور پانی کی شدید قلت، فرقہ وارانہ تشدد، خوراک کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے اور بھارت کے ساتھ ساتھ امریکہ اور مغرب کے خلاف غصے کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے اس میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔ عارضی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نسلی اختلافات، پیٹرن کلائنٹ کے حامل تعلقات اور طاقتور سکیورٹی فورسز کی وجہ سے اس قسم کی قومی حتیٰ کہ علاقائی تحریک پیدا ہونے کا امکان بھی کم ہے۔ اگرچہ بڑھتی ہوئی انتہاپسند قوتوں، سمجھوتے پر آمادہ فوج یا مڈل کلاس کے سسٹم پر اعتماد ختم ہونے کی صورت میں صورت حال ایک دم تبدیل بھی ہوسکتی ہے تاہم بیلاگیو ورکشاپ کے شرکاء کا اتفاق رائے ہے کہ کم از کم اگلے پانچ سالوں تک کوئی بڑی تبدیلی آنے کا امکان نہیں۔

فوج

کئی سالوں سے پاکستان میں فوج کا کردار مرکزی رہا ہے تاہم یہ کتنا نقصان دہ تھا اس کے حوالے سے آراء میں اتفاق موجود نہیں۔ یہ صرف پاکستان کی ایک فوج نہیں بلکہ ایک صوبہ یعنی پنجاب ہے جس کی فوج میں نمائندگی افسروں اور جوانوں دونوں کی سطح پر سب سے زیادہ ہے چنانچہ جب فوج کوئی سیاسی مداخلت کرتی ہے تو یہ صرف ریاست کی ایک محض بیوروکریسی نہیں ہوتی بلکہ یہ پنجاب کے دیگر تمام صوبوں سے تعلقات کو بھی متاثر کرتی ہے۔ حالیہ دنوں میں پاکستانی فوج پر سب سے زیادہ جن حلقوں کی جانب سے تنقید سامنے

MashalBooks.org

آئی ان میں لبرل پاکستانی اور انڈین دونوں شامل ہیں۔اب مغربی پریس بھی اس میں خامیاں ڈھونڈنے لگا ہے جس کی وجہ پاکستانی فوج کے دہشت گردگروپوں سے تعلقات اور آئی ایس آئی کے ذریعے افغان طالبان کی امداد شامل ہے۔

فوج کی مرکزیت کے تین پہلو پاکستانی مستقبل کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔یہ ایک دوسرے سے باہم منسلک ہیں تاہم ان کو الگ الگ بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ان میں اول، ملک کو لاحق سٹرٹیجک خطرات کے حوالے سے فوج کا فہم بالخصوص بھارت کے حوالے سے اس کی مصروفیت،دوئم،فوج کے سویلین اتھارٹی کے ساتھ تعلقات، اورسوئم فوج کے عسکریت پسند اور انتہاپسند گروپوں اور بنیاد پرست اسلام پسندوں سے تعلقات ،جس کی جڑیں1947 اور1971ء میں ہی پڑ چکی تھیں۔

پاکستانی فوج اور بھارت

بھارت کا بھوت اسی وقت سر پرسوار ہوگیا تھا جب پاکستانی فوج نے جنم لیا تھا۔اس کا ماخذ بھی انڈین آرمی تھا۔ اس کی1947ء میں ہی بھارتی فوج سے جنگ ہوگئی تھی اور یہ پاکستان کو درپیش ہر خطرے کے پیچھے بھارت کو ہی دیکھتی ہے۔اگرچہ اس میں سے کچھ خطرات حقیقی ہیں تاہم ان کی بنیاد پر بھارت کو بھوت کی طرح سر پرسوار کرنے کےفوج کے مجموعی رویے کو برداشت نہیں کیا جاسکتا جس کی وجہ سے فوج کا پیشہ وارانہ نکتہ نظر متاثر ہوتاہے اور ایسے حلقوں کے بارے میں اس کی رائے تشکیل پاتی ہے جو کہ بھارت کو پاکستان کے لیے بنیادی مسئلے کے طور پرنہیں دیکھتے یا جوسمجھتے ہیں کہ بھارت کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ پاکستان کے لیے بہترین آپشن ہے۔یہ ایک ایسا نکتہ نظر ہے جو پاکستان میں گہرائی کے ساتھ جڑنہیں پکڑسکا جس کی کچھ وجہ بھارت بھی ہے جو پاکستان کے بارے عموی طور پر سخت موقف رکھتا ہے۔ذیل میں بھارت کے حوالے سے الگ سے بحث کریں گے۔

فوج اورسویلین اتھارٹی:

جیسا کہ عاقل شاہ لکھتے ہیں کہ تاریخ کے نقش قدم کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ پاکستان اپنے آپ کو اس صورت حال سے نکال پائے گا جس میں وہ ایک ایسی ریاست کی حیثیت رکھتاہے جس پرفوج کا غلبہ ہے اور جس میں خارجہ

پالیسی تک پر اس کا کنٹرول ہے جس کی بنیاد ملک کی آزادی کے بعد پہلے عشرے میں ہی رکھ دی گئی تھی۔اس ''فوجی ریاست'' کے ماخذات کی طرف دیکھا جائے تو اس میں بھارت کی جانب سے لاحق خطرات کی سوچ بھی شامل ہے اور اس خطرے کی بنیاد پر پھیلی ہوئی ایک طاقتور فوج کا پاکستان کے ممکنہ مستقبل میں کردار جاری رہے گا۔

عاقل اور دیگر شرکاء پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے کئی منظر نامے بیان کرتے ہیں جن میں درمیانی عرصے میں سیاسی نظام کو منجمد کیے جانے اور مکمل جمہوریت اور فوجی آٹوکریسی کے درمیان گرے زون کی موجودگی بھی شامل ہیں۔ اگرچہ فوج کے اوپر کسی قسم کا سویلین کنٹرول لانے کی صورت میں ٹرانزیشنل جمہوریت کے لیے شدید قسم کے چیلنجز سامنے آسکتے ہیں، اس منظر نامے میں جہاں سویلین حکومت کی ذمہ داری ہو اور وہ گورنس کے کئی اہم ایشوز (جیسے غیر مستحکم معیشت اور توانائی کا بحران) کے حوالے سے دباؤ کا شکار ہو تو فوج ایک سائے میں رہتے ہوئے اپنا کام کرتی رہے گی اور جمہوری سیاست اور خارجہ پالیسی کے ضمن میں کسی قسم کے غیر مطلوبہ نتائج کو روکتی رہے گی۔طاقت کے نئے مراکز جیسے عدلیہ وغیرہ توازن قائم رکھنے والے اثرات مرتب کرتے اور قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانے میں مدد دیتے رہیں گے۔تاہم سویلین بحران میں مزید فوجی ثالثی کے منظرنامے میں سویلین ملٹری تعلقات کا وہی خصوصی نمونہ سامنے آئے گا جو کہ باضابطہ انتخابی حکمران میں ہوتی ہے۔

دوسرا جو ممکنہ مستقبل ہوسکتا ہے اس میں سویلین ملٹری تعلقات اور جمہوریت کے استحکام کا عمل سستی اور مستقل مزاجی پر مبنی ہوگا تاہم اسکے لیے دو بڑی پارٹیوں میں کسی قسم کے اتفاق رائے اور ان کے ربط اور حکومت کرنے کی صلاحیت میں بہتری کی ضرورت ہوگی۔ دو جماعتوں کی طرف سے حالیہ دنوں میں پارلیمانی جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لیے مل کر کام کرنے کی خواہش سے سامنے والے عملی نتائج جیسے کہ آئین کی شق 58-2b کا خاتمہ کرکے صدر کے اس اختیار جس کے تحت کو وہ اسمبلیاں توڑ سکتا تھا کو ختم کرنا اور صوبوں کو خاصی خودمختاری دینا، جمہوریت کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔1990ء کی دہائی کی طرح اس مرتبہ بھی دونوں پارٹیوں نے فوج کے خلاف مزاحمت کا کھلے عام مظاہرہ کیا۔اگرچہ دونوں پارٹیوں کے درمیان حالیہ دنوں میں الفاظ کی ایک بھرپور جنگ دیکھنے میں آئی ہے جس کے تحت ایک دوسرے پر الزام تراشی کی گئی جن میں مسلم لیگ (ن) کی زیرحکومت صوبہ پنجاب

میں عسکریت پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے الزامات شامل تھے تاہم مجموعی طور پر یہ دونوں پارٹیاں اپنے تجربات سے یہ بات سمجھ چکی ہیں کہ ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ رول آف دی گیمز کے تحت چلیں اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے رویے کا مظاہرہ کرتے رہیں بجائے اس کے سسٹم کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کا رسک لیں اور اقتدار ایک اور عشرے کے لیے فوج کے آگے ہار جائیں۔

زرداری حکومت کے تجربات کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر سویلین سیٹ اپ اسی طرح ایک مسابقتی انتخابی طریقہ کار کے تحت کام کرتا رہا اوراس کے ساتھ1973ء کے آئین کا حلیہ بگاڑنے والی قانونی اور آئینی ترامیم کے حوالے سے بتدریجی طریقے سے اصلاحات کرتا رہا تھا تو کسی حد تک جمہوریت کے استحکام کی امید پیدا ہوجائے گی۔ سیاستدان نازک سٹرٹیجک موضوعات پر فوج کے ساتھ اختلاف کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے سیاسی طور پر اپنے لیے مزید کچھ جگہ بنا رہے ہیں اور ساتھ ہی صوبائی اور مرکزی دونوں سطحوں پر مخلوط حکومت کی صورت میں ایک ساتھ کام کرنے کا نیا رجحان سامنے آنے سے ان کے اس ادراک اور فہم میں اضافہ ہوگا کہ جمہوریتیں کس طرح کام کرتی ہیں۔

تاہم غلطی کی گنجائش بہت کم ہے۔اگرچہ یہ سچ ہے کہ فوج اب جلد اقتدار میں آنے کا ارادہ نہیں رکھتی اور امریکہ کی جانب سے جمہوری عمل میں اس کی نئی دلچسپی سامنے آنے کے بعد سیاست دانوں کی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔تاہم پاکستان کے دیگر حامی بشمول چین اور خلیجی ریاستیں پاکستان میں جمہوری اصلاحات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں اور جب تک امن و امان کنٹرول میں رہتا ہے انہیں اس بات کی کوئی پروانہیں کہ پاکستان میں فوجی حکومت ہو یا آمرانہ نظام ۔اسکے علاوہ یہ بھی دیکھا جائے کہ'' ون مین ون ووٹ، ونس'' کا سلسلہ عارضی طور پر ختم ہو چکا ہے اور یہ کہ بلدیاتی، صوبائی اور قومی سطح کے الیکشن میں اسلامی جماعتوں کی شرکت کے ذریعے انہیں قائل کیا جارہاہے۔اعتدال پسند مرکزی جماعتوں نے دو مرتبہ یعنی 1970ء اور 1997ء میں اسلام پرستوں کو انتخابات کے ذریعے روک دیا۔2008ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی نے بائیکاٹ کیا جبکہ جمعیت علمائے اسلام (ف) نے قومی اسمبلی کی صرف آٹھ نشستوں پرکامیابی حاصل کی جبکہ اس نے 108 نشستوں پرالیکشن میں حصہ لیا تھا۔تاہم زرداری حکومت کی ناقص معاشی کارکردگی، گورنس میں اس کو درپیش

سٹرکچرل مسائل اور دائیں بازو کی طرف غیر پارلیمانی طاقتوں میں اضافہ اور اس کے نتیجے میں سماجی تشدد، قتل و غارت اور دہشت گردی بڑھنے سے اس کی کسر نکل گئی۔

تاہم عاقل شاہ اپنے پیپرز میں مزید لکھتے ہیں کہ جمہوری انسٹی ٹیوشن لائزیشن میں مزید توازن قائم کرنے کے لیے ایکویشن کی سویلین سائیڈ پر مزید توازن کی ضرورت ہے۔اس کے لیے ایک ایسی فوج کی ضرورت ہے جو جمہوری فریم ورک میں رہتے ہوئے ایک ماتحت کردار ادا کرے۔فوج کا رویہ حکومت سے دست برداری کے بعد بظاہر تبدیل ہو چکا ہے تاہم یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ فوج اس لیے بیرکوں میں واپس نہیں گئی کہ اس کے اندرونی کردار یا مزاج میں کسی قسم کی تبدیلی آئی ہے۔ یہ نہ تو اشفاق پرویز کیانی کا پروفیشنل ازم ہے اور نہ پرویز مشرف کے پیشہ وارانہ گریز کی کمی جو کہ فوج کے حالیہ سیاسی رویے کی وجہ ہو۔درحقیقت پروفیشنل ازم کبھی پاکستانی فوج کا مسئلہ رہا ہی نہیں۔ عاقل شاہ جب یہ کہتے ہیں تو یہ درست لگتا ہے کہ پاکستانی فوج کا ایک مخصوص پروفیشنل ازم یہی ہے کہ اس کی حکومتی نظام میں ایک مخصوص برتر حیثیت برقرار رہے۔

عاقل شاہ کا تیسرا اور سب سے زیادہ وسیع منظر نامہ ایک فوجی بغاوت کے پھوٹنے کا ہے جس کے بعد ملک میں فوجی سربراہی میں ایک آمرانہ حکومت قائم ہوجائے گی۔اس سلسلے میں ملکی اور بین الاقوامی عوامل ہیں جو اگرچہ اس منظر کو ختم تو نہیں کرتے لیکن جوابی ردعمل ضرور دے سکتے ہیں۔اگر ماضی کی طرف دیکھا جائے تو فوج اگلی مداخلت کے لیے لگ بھگ دس کا وقفہ تو ضرور دیتی ہے۔پاکستان کی نوتجدید شدہ سول سوسائٹی (وکلاء تنظیمیں، انسانی حقوق کے ادارے، این جی اوز اور میڈیا) اور زیادہ جمہوریت پسند پارٹیاں ایک مثبت پس منظر نامے کے تحت اس صورت حال کو یقینی بنائیں کہ فوج کو ایسا موقع نہ دیا جائے کہ وہ منتخب حکومت کو نقصان پہنچا سکے یا اس کا تختہ الٹ سکے۔

سول ملٹری تعلقات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے میں کسی حد تک پاکستان میں پائے جانے والے اس موقف کی حمایت کرتا ہوں کہ نیشنل سیکورٹی کونسل جیسے انتظامات کے ذریعے ''فوج کو اندر لاکر باہر رکھا جائے'' کی سوچ غلط ہے۔اس کے حق میں یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ اگر سول اور فوجی ادارے مل جل کر کام کریں گے تو مختلف چیزوں کے لیے برابر کے ذمہ دار ہوں گے اور یوں فوج کے لیے تنہا پرواز کرنا ممکن نہ ہوگا۔یہ بات نہ صرف غیر

جمہوری ہے بلکہ فوج کو ادارہ جاتی کردار دینے سے یہ بات بھی یقینی نہیں ہوجاتی کہ اس سے استحکام پیدا ہوگا حتیٰ کہ ترکی جیسے ملک میں بھی ایسا نہیں ہوسکا۔جیسا کہ میں نے1985ء میں لکھا تھا کہ فوج کو اقتدار سے نہیں نکالا جاسکتا اور نہ ہی امید کی جاسکتی ہے کہ یہ وہاں پر رہے بلکہ اس کو حکومت سے دستبردار کرنے کا انتظام کرنا ہوگا اور سویلین مہارت، اگر اس کا مظاہرہ ہوگا، ہی بتدریج اس کی جگہ لے گی۔ ایسا چند معاملات میں نہیں ہوسکتا جیسا کہ نیچرل ڈیزاسٹر ریلیف جس میں فوج ہی وہ واحد ادارہ تھا جس نے بحران میں اپنی حقیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا جب زلزلے اور سیلاب کے دوران فوج اور دیگر نجی اداروں نے اپنی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور لوگوں کو ریلیف فراہم کیا۔

سویلین صلاحیت کو راتوں رات پیدا نہیں کیا جاسکتا اور نیشنل سیکورٹی کونسل جو کہ تعلیم کے میدان اور سویلین اداروں کو مستحکم بنانے کے مشن کے ساتھ کام کرنے سے نہ صرف پالیسی کوآرڈی نیشن جیسے سنجیدہ معاملات کا کوئی حل سامنے آئے گا بلکہ اس سے سویلینز کو بھی ان فیصلوں کے حوالے سے سوشلائز کرنے میں مدد ملے گی جو اس سے پہلے خصوصی طور پر فوج کی ذمہ داری سمجھے جاتے تھے۔کئی سینئر ریٹائرڈ فوجی افسران اور حکام یہ بات لکھ اور کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کے اقدامات سے فوج اور سویلین لیڈروں کے درمیان تعلقات بہتر بنانے میں مدد ملے گی تاہم ابھی تک اس نظریے کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔

فوج اور اندرونی عسکریت:

پاکستان کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کو نہ صرف اندرونی خطرات کا سامنا ہے بلکہ بیرونی خطرات بھی بدستور موجود ہیں۔فوج کا پہلا ردعمل تو یہ ہے کہ پاکستان میں دہشت گرد اور علیحدگی پسند گروپوں کے پیچھے موجود بھارتی ہاتھ کو دیکھے۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھارت کے کردار کو دیکھا جائے تو یہ کوئی ناپسندیدہ ردعمل بھی نہیں ہے۔لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ پاکستانی فوج ہی ہے جو پہلے ان گروپوں کی پشت پناہی کرتی رہی ہے اور وہ اب اسے انہی کی جانب سے لڑائی کا سامنا ہے۔

پاکستانی فوج عسکریت پسندی کے خلاف آپریشن کو منظم طریقے سے تیز کررہی ہے۔یہ کام اب فوج کی اس روایتی سٹرٹیجی کے بعد ہوا ہے جس کے تحت تنازعہ کو کم سے کم شدت پر

رکھا جاتا تھا جو کہ تیز رفتار ان اینڈ آؤٹ آپریشنوں پر مشتمل تھا۔اب فوج اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اسے عسکریت پسندی کے خلاف مضبوط سویلین کردار کی بھی ضرورت ہے جو کہ شمال مغربی سرحدی علاقے میں گہرائی کے ساتھ موجود ہے اور اس کا اظہار فوج کی حالیہ تحریروں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ ایک اور چیز جو سنگین نتائج کی حامل ہے اور جسے فوج کی جانب سے اب تک نمٹا نہیں گیا وہ ایسے عناصر کو روکنے اور ختم کرنے کا ہے جو کہ تحریک طالبان پاکستان کی طرح ہی ریاست کو نشانہ بناتے ہیں لیکن جن کا تعلق پنجاب سے ہے۔اس چیز کے واضح شواہد موجود ہیں کہ فوج تصوراتی اور ادارہ جاتی دونوں اسباب کے تحت ایسا کرنے سے گریز کرتی رہی ہے اور اس کا جواز یہ پیش کرتی رہی ہے کہ وہ شمال مغربی سرحد پر بہت زیادہ مصروف ہے۔فوج کو وہاں پر شدید جانی نقصان کا سامنا ہے اور اسے پشتون لڑاکوں جنہیں پنجابیوں کی مدد حاصل ہے کے خلاف سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔اس عمل کے ایک قریبی شاہد کا کہنا ہے کہ جو افسر وزیرستان سے لڑ کر واپس آرہے ہیں وہ وہاں پر اپنی موجودگی کے حوالے سے ''حملہ آور'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔وہ اپنے کردار پر فخر نہیں کرتے تاہم ریاست کو عمومی طور پر اور فوج کو خصوصی طور پر دیے جانے والے کھلے چیلنج کے باعث اندرونی عسکریت پسندی بھارت سے زیادہ بڑا خطرہ بن چکی ہے۔

بنیادی گورننس

پاکستان کو اپنی چالیس سالہ تاریخ کے دوران جس سب سے تباہ کن پیش رفتوں کو سامنا رہا ہے وہ منظم طریقے سے ریاست کے ہاتھوں ریاست کی تباہی ہے۔یہ مکمل طور پر دستاویزی طور پر موجود ہے اور یہ ختم نہیں ہوا اور شاید ختم ہو بھی نہیں سکتا۔یہ پاکستان کی ایک بڑی کمزوری ہے جسے فوج کے اس معمول نے اور بھی خراب کر دیا ہے جس کے تحت فوج وہ کام بھی خود کرنے کی کوشش کرتی ہے جو عام طور پر سویلینز کی ذمہ داری ہوتی ہے۔چنانچہ یہاں سے مسئلہ سول ملٹری تعلقات سے آگے بڑھ کر ریاست کی ٹیکسوں،تعلیم اور امن وامان کے قیام کی صلاحیت اور سٹرٹیجک پالیسی سازی اور فوجی، معاشی اور انتظامی نظام کو ہم آہنگ کرتے ہوئے ایک مرکزی فیصلہ سازی کے عمل میں تبدیل کرنے کی صلاحیت سے تعلق رکھتا ہے۔پاکستانی ریاست کی کمزوری کو پاکستان کی گورننس کے تمام معاملات میں کم تر درجہ بندی

کے اشاریوں سے سمجھا جاسکتا ہے جن میں جرائم، کرپشن، اور ریاست کے بارے میں رکھاجانے والا رویہ اور ناکام ریاستوں کی فہرست میں اس کی درجہ بندی شامل ہے جو کہ 2007ء میں بارھویں نمبر پر تھا اور اب حال میں ٹاپ ٹین میں شامل ہے اور''نازک'' حیثیت کا حامل ہے۔آخر الذکر کسی حد تک مبالغہ آمیز ہے کیونکہ اگرچہ پاکستان اپنی زیادہ تر ادارہ جاتی یکجہتی سے محروم ہوچکا ہے تاہم تباہ ہوچکے افغانستان کے مقابلے میں یہ اب بھی ایک قابل ذکر وجود رکھتا ہے۔

بہرحال ریاست سے مطالبات بڑھ رہے ہیں جبکہ اس کی صلاحیت کم ہورہی ہے اور آبادی بھی ایک حیران کن تناسب سے بڑھتی جارہی ہے۔یہ ایک ایسا مقابلہ ہوسکتا ہے جو پہلے ہی ہارا جاچکا ہے۔سب سے بالائی سطح پر موجود غیر مربوط ہونے کی حالت خاص طور پر تشویش ناک ہے۔بحران در بحران، بالخصوص سیکورٹی کے معاملات میں،کی وجہ سے ریاست کا فیصلہ سازی کا نظام ناکام ہوچکا ہے۔چاہے کارگل کا ایشو ہو یا ممبئی حملے یا نائن الیون کے حوالے سے ردعمل اور بھارت سے مذاکرات دوبارہ شروع کرنے کی ناکام کوشش(جس سے بھارت اور باقی دنیا کے سامنے پاکستانی حکومت کی اس حوالے سے نااہلی کی عکاسی ہوتی ہے کہ عسکریت پسند اس کے قابو میں نہیں)، حکومت غیر موثر دکھائی دیتی ہے۔مسائل کی ایک وجہ تو سول ملٹری کی تقسیم ہے اور دوسری برطانوی راج سے ملنے والے عظیم اثاثے سے اس کی محرومی ہے یعنی ایک ایسی سول سروس جو کام کرتی تھی اور سول سروس اور سیاست دانوں کے درمیان تعلقات کار وغیرہ۔خرابی کی جڑ ظاہر ہے کہ فوج کی طرف سے سیاست دانوں اور بیوروکریٹس دونوں کو دبانے کا رویہ ہے لہٰذا ایک بار پھر ان بنیادی اصلاحات کی ضرورت ہے جس کا مقصد حکومتی معاملات میں فوج کے حد سے بڑھے کردار کو ختم کرنا ہے جسے جواب میں ریورس کرنا بہت مشکل ہو۔اس میں اگر عشرے نہیں تو کئی سال ضرور لگیں گے اور اس کے لیے امن کے ایک طویل عرصے کی ضرورت ہوگی حتیٰ کہ سویلین قابلیت میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہوجائے۔

عدلیہ اور وکلاء

عدلیہ اور قانون کا پیشہ پاکستان کے مستقبل کی تشکیل میں کسی بڑے کردار کے لیے

بمشکل ہی کوالیفائی کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ججوں بالخصوص چیف جسٹس کی کارروائی کے نتیجے میں مشرف حکومت بحران سے دوچار ہوئی اور وکلاء کے مارچ نے اس کے زوال میں کردار ادا کیا لیکن اس بات کے کوئی شواہد موجود نہیں کہ ادارے کے طور پر عدالتیں یا وکلاء اسٹیبلشمنٹ کی حمایت نہیں کریں گے یا فوج کے خیالات کا ان پر شدت کے ساتھ اثر نہیں ہوگا۔ایک سینئر امریکی صحافی جس نے پاکستان میں خاصا عرصہ گذارا اس کے بقول جسٹس افتخار محمد چودھری بہت مقبول ہیں اور وہ انصاف چاہتے ہیں اور سیاست دان نہ ہوتے ہوئے بھی وہ موجودہ پاکستان کے تناظر میں سچے انقلابی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک ہی جست میں پاکستان کو ایک نارمل جمہوریت والا ملک بنانا چاہتے ہیں لیکن اس سٹرٹیجی کو نہ تو فوج اور نہ ہی سیاست دانوں کی طرف سے حمایت حاصل ہے۔

پاکستان کو مغرب کی عظیم قانونی روایات ورثے میں ملی ہیں اور اس کے وکلاء دنیا میں بہترین سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی طاقت محدود ہے۔ان کے پاس کوئی مستقل سٹریٹ پاور نہیں اور قانون کے بالاتر ہونے کا تصور پاکستان میں اس قدر مانا نہیں جاتا جہاں طاقت اور جبر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ عدالتیں اور جج ہی ہیں جو پاکستان میں فوجی حکومتوں کو استحکام کے نام پر جائز قرار دیتے آئے ہیں۔بعض مواقع پر وہ فوج کے انفرادی جرنیلوں کے خلاف اٹھتے رہے ہیں لیکن انہوں نے بطور ادارہ فوج کے خلاف مزاحمت نہیں کی۔

نیو میڈیا

اس اصطلاح کو امریکی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن نے استعمال کیا۔ نیو میڈیا نے دنیا بھر میں ایک نیا نروس سسٹم تخلیق کر دیا ہے۔ ماضی میں کئی سالوں تک پاکستانی حکومتیں ریاست کے زیر کنٹرول میڈیا (سرکاری میڈیا) کے ذریعے عوام کو بے وقوف بناتی رہی ہیں۔اس میں فلسطین اور کشمیر اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ پاکستانیوں کے لیے ان ایشوز پر ایک زور دار موقف اختیار کرنا ان کی قومی شناخت کا حصہ تھا۔ بے نظیر کی اصلاحات سے پہلے تک پاکستانی پریس پر سخت کنٹرول رکھا جاتا تھا اور میڈیا کے متعدد اداروں کو ریاست کی جانب سے کنٹرول کیا جاتا تھا اور وہ ریاست کی ملکیت تھے۔

اب ذرائع اور پیغام دونوں ذومعنی اور مشکوک ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں مبہم اور

متضادات اطلاعات کا طوفان برپا ہے اور پاکستانی اور اسلام دونوں عالمی میڈیا کا ہدف بن چکے ہیں۔اس سے پڑھے لکھے پاکستانی شدید متاثر ہوئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ مغربی میڈیا ان کے ملک کو غیر منصفانہ طور پر ہدف بنا رہا ہے اور وہ میڈیا کی سازش کا شکار ہو چکے ہیں۔پاکستان کا اپنا میڈیا بالخصوص کیبل ٹی وی اہم معاملات کے بارے میں معیاری تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں اور پاکستانی میڈیا کی لبرلائزیشن جسے عام طور پر سول سوسائٹی کو مضبوط بنانے کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔کرسچیئن فیئر کے بقول پاکستان کا نجی میڈیا پرجوش اور متنوع ہے جس میں جیو ٹی وی جیسے ادارے عالمی معیار کے مطابق ہیں تاہم قومی سطح کے سلامتی کے معاملات اور اندرونی متنازعہ امور کے حوالے سے بہت زیادہ سیلف سنسر کے شکار ہیں اور ایسے تجزیہ کاروں سے متاثر ہیں جو فوج اور انٹیلی جنس اداروں سے تعلقات رکھتے ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ سماجی میڈیا کے نئے ادارے اور اطلاعاتی طریقے جیسے ایس ایم ایس سروسز وغیرہ پاکستان میں اطلاعات کی بہت تیزی سے ترسیل میں مصروف ہیں اور سول سوسائٹی کو اس طرح متحرک کر رہی ہیں جو کہ ریاست کی پہنچ سے باہر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سینئر جرنیل اس کو پریشانی اور تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔تاہم میڈیا کی اس سرگرمی نے نہ صرف لبرل طاقتوں بلکہ بنیاد پرست اور اسلامی گروپوں کو بھی مضبوط بنایا ہے جو خود بھی جدید ٹیکنالوجی کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔چنانچہ میڈیا کی لبرلائزیشن کے مجموعی اثرات تاحال نامعلوم اور ایک اہم سوال ہیں جن کے لیے گہرائی کے ساتھ سٹڈی کی ضرورت ہے۔

چنانچہ پریس اور نیو میڈیا پاکستان میں کسی قسم کی سرگرمی ابھارنے اور تبدیلی لانے کے حوالے سے وائلڈ کارڈ ہے۔نیو میڈیا اور سماجی نیٹ ورک پاکستان کے روایتی مناظرے کے نمونے کو بڑھاوا دیتے ہیں حتیٰ کہ ملا حضرات نماز جمعہ کے موقع پر جو خطبہ دیتے ہیں اس پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔میڈیا میں جو بھی کچھ ہے وہ وائلڈ کارڈز سے بھرا ہوا ہے جو پاکستان کی روایتی قدامت پرستی میں توازن لاتا ہے۔تاہم مساجد اور مدارس میں تاحال قدامت پرستی کا راج ہے جہاں پر غیر متعلق سے لیکر سخت گیری پر مشتمل ہر قسم کے وعظ و خطبات دیے جاتے ہیں۔

انتقال اقتدار

پاکستان کا ایک اور بنیادی مسئلہ سیاسی عدم استحکام اور اقتدار کی منظم طریقے سے منتقلی کی صلاحیت سے محرومی کا ہے(اس کے دوسرے آزادانہ الیکشن1988ء میں جا کر ہو سکے جبکہ 1971ء میں پہلے آزادانہ الیکشن کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں برآمد ہوا) اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک حکومت سے دوسری حکومت کو اقتدار کیسے منتقل ہوا۔دائیں اور بائیں بازو دونوں کے نقادوں کا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ پاکستان میں کون حکومت کرتا ہے اس کی اہمیت نہیں ہے۔لیکن اقتدار کی پرامن اور منظم طریقے سے منتقلی جس میں جیتنے اور ہارنے والا نتائج کو کھلے دل سے تسلیم کریں اور آگے بڑھیں اور جو کہ نارمل سیاسی عمل کے لیے بنیادی نوعیت کی اہمیت رکھتا ہے، پاکستان میں یہ روایت اس وقت سے ہی غائب ہے جب یہ ملک وجود میں آیا تھا۔

پاکستان میں اقتدار کی منتقلی کس طریقے سے ہوتی ہے اس میں کچھ تبدیلیاں دکھائی دینے لگی ہیں۔اگر پاکستان اپنے موجودہ راستے پر چلتا رہتا ہے جس میں کہ آزاد الیکشن ہوتے ہیں قانون کی عملداری کرائی جاتی ہے اور سول ملٹری تعلقات میں مزید بہتری آتی ہے تو یہ ایک بڑی تبدیلی ہوگی۔ماضی میں صرف یہی مسئلہ رہا ہے کہ فوج اقتدار پر قبضہ کرنے سے پہلے کتنا برداشت کرتی ہے اور اہم قانون دان کس طرح اس کے اقتدار کو جائز بنانے کے لیے آگے آتے ہیں اور سیاست دان اقتدار میں معمولی سا بھی حصہ حاصل کرنے کے لیے کس طرح قدم بڑھاتے ہیں۔

جنرل مشرف کا اقتدار تک پہنچنا ایک کلاسیکی نمونہ ہے:ایک نااہل جمہوری حکومت کو ایک ذاتی عزائم رکھنے والے جرنیل نے اقتدار سے ہٹادیا جس کا وزیراعظم نواز شریف واضح طور پر نااہل دکھائی دیتا تھا اور زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی مہم پر تھا۔وہ ایک ڈکٹیٹر بننے کی راہ پر گامزن تھا جب مشرف نے ایک قابل اور اہل حکومت کے قیام کے نام پر اقتدار پر قبضہ کیا اور پھر خود کو ابتدائی عشروں کے ڈکٹیٹر ایوب خان کی طرح سمجھنے لگا۔

اقتدار کی زرداری کو منتقلی بھی ایک مخصوص نمونے کی حامل ہے۔ایوب، یحییٰ اور ضیاء کی طرح اس بار بھی فوج اپنی ساکھ کھو بیٹھی۔لیکن اس بار پاکستان بین الاقوامی سطح پر پہلے کے

مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا تھا جس پر بااثر بیرونی طاقتوں نے منصوبہ بندی کی اور منتقلی اقتدار کو تشکیل دیا۔اس کا مقصد پاکستان میں حقیقی جمہوریت کا قیام نہیں بلکہ مشرف کو اقتدار میں رکھنے کا سوا کچھ نہ تھا۔حقیقت میں اس بات کی منصوبہ بندی امریکہ اور برطانیہ نے ہی کی تھی جس کے تحت مشرف کی جانب سے بے نظیر کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ پاکستان لوٹے۔ الیکشن میں حصہ لے اور صدارتی نظام کے تحت ایک بار پھر پاکستان کی وزیراعظم بنے۔اس سلسلے میں ساری سودے بازی امریکی سفیر ریان کروکر اور برطانیہ ہائی کمشنر مارک لائل گرانٹ نے کرائی لیکن کسی حکومت نے اس عمل میں کسی دوسرے پاکستانی سیاست دان کو شامل کرنے کا نہ سوچا جس کے نتیجے میں بے نظیر نہ صرف ان لوگوں کا ہدف بن گئی جو کہ اسکے مخالف تھے بلکہ ان عناصر کا بھی جو کہ مشرف کو پاکستان کے صدر کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کا نتیجہ ایک کمزور صدر اور ایک کمزور وزیراعظم کی صورت میں برآمد ہوا جو کہ ایک مضبوط لیڈر، جیسے کہ بے نظیر ہوسکتی تھی، کے مقابلے میں پاکستان کی کارپوریٹ فوج کے لیے زیادہ قابل قبول تھا۔یہ منتقلی اقتدار اتفاقی تھی جس کی وجہ بے نظیر کی موت اور افغان جنگ کے حوالے سے مجبوریاں تھیں۔ جب یہ بات واضح دکھائی دینے لگی کہ مشرف ملک میں استحکام لانے کی صلاحیت نہیں رکھتا جس پر بے نظیر اور مشرف کے درمیان ایک سودے بازی کرائی گئی اور جس کے نتیجے میں مشرف کی روانگی عمل میں آئی کیونکہ وہ ایک اختلافی شخصیت بن چکا تھا۔ تاہم2010ء سے یہ پتہ چلا کہ ایک کمزور حکومت بھی بڑی اصلاحات کا آغاز کرسکتی ہے(پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی حکومت سے زیادہ) تاہم اس کے بعد اسے جن چیلنجز کا سامنا تھا وہ بہت بڑے تھے۔

پاکستانی ریاست کی قابلیت کو متاثر کرنے والے جو عوامل ہیں وہ عمومی طور پر منفی ہیں۔زرداری انتظامیہ کی جانب سے نظام کی اصلاحات کی کوششوں کے باوجود طاقت کے مراکز۔۔۔ جیسے سول بیوروکریسی، اعلیٰ سطح کا فیصلہ سازی کا نظام اور سرکاری نجی تعلقات کا ر نظام۔۔۔تمام کے تمام غیر مربوط ہیں۔ریاست کو اپنی اس یکجہتی کو تاحال واپس حاصل کرنا ہے جو اسے چالیس پچاس سال پہلے حاصل تھی۔کرپشن میں زبردست اضافہ ہورہا ہے تاہم یہ بھی اس صورت میں قابل قبول ہوجائے گی کہ اگر یہ جدید ریاست میں متوقع تمام بنیادی

سہولتوں کو فراہم کر سکے۔ میڈیا اور این جی اوز ریاست کا متبادل نہیں ہو سکتے اور فوج جو کہ سب سے طاقتور ادارہ ہے اس کی جانب سے بنیادی اصلاحات کی حمایت نہیں کی جاتی۔

4#بیرونی و عالمی عوامل

اس وقت جو کلیشے ہے وہ یہ ہے کہ پاکستانی خود اپنی موجودہ حالت کے ذمہ دار ہیں اور وہ مبالغے کی حد تک اس تصور کا شکار ہیں کہ پاکستان کی حالت کو بیرونی عوامل بگاڑ رہے ہیں۔ہم افغانستان، امریکہ، چین اور بھارت کے کردار اور گلوبلائزیشن کے پاکستان پراثرات اور ایٹمی ملک ہونے کی وجہ سے پاکستان کی حیثیت پر الگ سے بات کرتے ہیں۔

افغانستان

کئی سال پہلے نیشنل انٹیلی جنس کونسل (این آئی سی) پاکستان کے بارے میں اپنی حتمی رپورٹ میں اس کا اس کے اپنے معیارات(جن کے بارے میں این آئی سی کی پہلی رپورٹ بہت زیادہ قابل تشویش تھیں) کے حوالے سے جائزہ نہیں لیا تھا بلکہ اس کا تمام تر انحصار اس کے افغانستان کے ساتھ تعلقات کی بنیاد پر تھا۔ اس کا اظہار امریکی ترجیحات میں تبدیلیوں سے ہوتا تھا جن میں2010ء کے اواخر تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔افغانستان میں امریکی فوج کی موجودگی کی وجہ سے پاکستان کا استحکام اور مستقبل اہم ہیں لیکن یہ ثانوی مسئلہ ہے۔2010ء کے اواخر میں ہونے والی بات چیت کے مطابق افغانستان میں بھارت کا کردار تک یا پاک بھارت تعلقات جو کہ اسلام آباد کے لیے بہت اہم ہیں، امریکی حکام کی جانب سے ان پر بہت کم توجہ دی جا رہی تھی۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان ہمیشہ دو رویہ بہاؤ رہا ہے۔کئی سالوں سے پاکستان کا افغانستان میں سیاسی کردار رہا ہے جو زیادہ تر اس کی جانب سے طالبان کی حمایت سے متعلق رہا ہے جو پہلے کھلے عام اور اب خفیہ طور پر ہے لیکن اب ایک الٹا بہاؤ بھی ہے۔پاکستان کے مستقبل کا بہت سا دارومدار افغانستان میں ہونے والی پیش رفتوں پر ہے جو کہ پاکستان پر تین طرح سے اثر انداز ہو سکتا ہے:

اول : ملک میں بھارت کی مداخلت

دوئم : امریکہ کی موجودگی

سوئم: پشتون آبادی کی وجہ سے جنم لینے والے پاکستان اور افغانستان کے تعلقات

پاکستان واحد ملک ہے جس کے افغانستان کے ساتھ تعلقات اسکے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کہ پشتونوں کی نقل وحرکت اور اس کا یہ کا دعویٰ کہ اسلام اور قومی وحدت نسلی تقسیم سے بالاتر ہے، پاکستان کی سرحدوں کے لیے چیلنج ہیں۔

امریکہ کے افغانستان کے ساتھ تعلقات بھی پاکستان پر اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ اس کے لیے اسلام آباد سے زیادہ قابل اہم ہے۔اگرچہ پاکستانی سمجھتے ہیں کہ انہیں امریکہ پر اعتماد نہیں اور انہیں کسی بھی انتہائی صورت حال کے تیار رہنا چاہیے۔وہ اس حوالے سے بنیادی تشویش رکھتے ہیں کہ امریکی افغانستان کے مطلوبہ اینڈ سٹیٹ تشکیل نہیں دے سکتے جو کہ حصول کے لیے کم تر سٹرٹیجی ہے۔پاکستان کا مرکزی مقصد جوکہ فوج کے خیالات کے مطابق یہ ہے کہ افغانستان میں بھارت کے اثر کوکم سے کم سے کیا جائے اور افغانستان میں کوئی ایسی حکومت قائم ہوجو پاکستان کے لیے کم سے کم حریف ہے۔سول یا فوجی حکومتوں دونوں میں پالیسی کا تسلسل جاری رہے گا۔پاکستان سکیورٹی مینیجر کے طور پر افغانستان میں اپنے کردار کودوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ پشتون آبادی افغانستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں موجود ہے اور دوسری یہ ہے کہ پاکستان کو امریکہ کی جانب سے افغانستان کی مد میں قابل زکر مالی اور سیاسی امداد ملتی ہے کیونکہ وہ افغانستان میں امریکی آپریشن کے لیے ایک اڈے کا کردار ادا کررہا ہے۔

تاوقتیکہ تحریر ہذا امریکہ اس بات کا اشارہ دے چکا ہے کہ وہ2011ء تک افغانستان سے اپنی فوج واپس بلالے گا تاہم امریکی انتظامیہ کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ افغانستان میں امریکہ کی موجودگی طویل عرصے تک رہے گی جو کہ غیر معینہ مدت سے لیکر غیر معینہ سطح کی ہی ہوسکتی ہے۔ایک اہلکار کے بقول یہ موجودگی کوریا طرز کی نہ ہوگی جو کہ ایک مضبوط اتحاد ہے اور افغانستان نیٹو کا رکن نہیں بنے گا تاہم یہ بالکل صفر بھی نہیں ہوگا۔کسی حد تک ایک اور ایک ہزار کا درمیانی آپشن سوچا جارہا ہے۔تاہم یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ صرف ایک سال بعد یعنی2012ء کے وسط میں افغانستان کیسا دکھائی دے گا۔

پاکستان کے نکتہ نظر کے مطابق اگر افغانستان میں طالبان فوجی یا سیاسی طور پر کوئی طاقت حاصل کرلیتے ہیں اور کابل حکومت کے ساتھ کسی قسم کے مخلوط اتحاد میں شامل ہوجاتے

ہیں تو صورتحال کے مستحکم ہونے کے امکانات کم ہوجائیں گے۔اگر اس اتحاد میں پاکستان کے کچھ بنیادی اتحادی شامل ہوجاتے ہیں تو پاکستان کے لیے افغانستان پر اثر انداز ہونے کے لیے کچھ چینل حاصل ہوجائیں گے۔اس میں طالبان کے سابق اتحادی حقانی نیٹ ورک،القاعدہ کوئٹہ شوریٰ اور پاکستان تک میں سرگرم اسلامی پارٹیاں شامل ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے اکثر گروپ کسی ایسے معاہدے کو قبول کریں گے جس سے انہیں افغانستان میں کام کرنے کے حوالے سے زیادہ آزادی حاصل ہوجائے۔اس کے بغیر وہ اوران کے سابق مجاہدین اتحادی بالخصوص جو حقانی نیٹ ورک یا حزب اسلامی میں موجود ہیں خطے سے باہر اسلامی مفادات کا علم بلند کریں گے۔ پاکستان میں ان کے القاعدہ اور جہادی تنظیموں کے ساتھ تعلقات بہت مضبوط ہیں۔ یہ گروپ اکٹھے ہونے کی صورت میں ایک ایسا نیٹ ورک تشکیل دیتے ہیں جو کہ مغربی اثرات کو ختم کرنے اور افغانستا ن میں ایک شرعی ریاست کی تخلیق کا عزم رکھتا ہے۔اس بات پر یقین نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ طالبان ازبکستان اور تاجکستان میں اسلامی عسکریت پسندوں کے حملوں میں مدد فراہم کریں گے جیسا کہ انہوں نے ایک عشرے قبل کیا تھا۔نہایت اہم بات یہ ہے کہ طالبان قوتوں کو توانائی بہم پہنچانے کے لیے ایک کامیاب افغان طالبان عسکریت پسندی یقینی ہے جو کہ پاکستان میں اسی قسم کی شرعی ریاست قائم کرنے کی کوشش کرے۔

رابرٹ بلیک ول کے مطابق آئندہ چند سالوں کے دوران ایساف اور امریکہ کی کاؤنٹر انسرجنسی سٹرٹیجی کی ممکنہ ناکامی متوقع ہے۔ یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ افغانستان میں سول تنازعہ پیدا ہوجائے اور ایک علاقائی پراکسی جنگ کا سٹیج تیار ہوجائے۔افغانستان کی نسلی اقلیتیں جن میں تاجک، ہزارے اور ازبک شامل ہیں ایسے کسی بھی نتیجے کی مزاحمت کرسکتے ہیں جس کے نتیجے میں طالبان کی حکمرانی بحال ہوجائے۔ وہ ایک عشرہ پہلے یہ بات جان چکے ہیں کہ طالبان صرف پشتونوں کی اکثریت والوں علاقوں پر کنٹرول سے مطمئن نہیں ہوں گے اور پورے ملک پر اپنی حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔طالبان کے سرپرست پاکستان کی طرح ایران، روس اور وسطی ایشیائی ممالک بھی افغانستان میں اپنے اپنے مفادات کو محفوظ بنانے کے لیے آگے آئیں گے۔ پاکستان کے لیے سب سے بڑی تشویش یہ ہوگی کہ خانہ جنگی کی صورت میں افغانستان میں بھارت کی سرگرمیاں بڑھ سکتی ہیں

اوراس میں اسے شاید امریکہ کی طرف سے بھی حوصلہ افزائی ملے۔مزید یہ کہ بھارت کی طرف سے فوجی مشاورت اور اسلحہ کی فراہمی بھی خارج ازمکان نہیں اور کچھ بھارتی تو یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ ایک نئی اور پاکستان مخالف افغان فوج کی تربیت کے لیے بھارت کے وسیع تربیتی مراکز کو استعمال کیا جائے۔ایران کے اثرورسوخ کو کم سے کم کرنے کے لیے سعودی عرب بھی افغانستان میں اپنے گروپوں کو استعمال کرے گا۔

افغانستان میں ایک نئی خانہ جنگی کی صورت میں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین جنم لیں گے اور ان میں سے بہت سے پاکستان کی طرف دوڑیں گے۔یہ مہاجرین پاکستان پر ایک نیامالی بوجھ بن جائیں گے۔پاکستان میں افراط زر اور بے روزگار اور ایک کمزور و کرپٹ حکومت کی موجودگی کی وجہ سے انتہا پسند گروپوں کا اشتعال میں آنا بھی خارج ازامکان نہیں۔ایک اور انتہائی ممکنہ نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں ایک بار پھر بھرپور طریقے سے فوج کا قبضہ ہوجائے اور مارشل لاء یا اسی قسم کی کوئی چیز نافذ کردی جائے۔

افغان طالبان اور کرزئی حکومت کے درمیان مذاکرات کے ذریعے کوئی سودے بازی ہوجاتی ہے تو یہ پاکستان کے لیے بھارتی اثرورسوخ کے آزاد افغانستان کے قیام اور خانہ جنگی سے بچنے کا بہترین راستہ ہوگا۔پاکستان اس وقت جو کوششیں کررہا ہے کہ وہ 1980ء کی دہائی کے اواخر میں اس کی ان کوششوں جیسی ہی ہیں جن کے ذریعے وہ سوویت افواج کی افغانستان سے واپسی کے بعد وہاں پر اقتدار کے خلاء کو پرکرنے کے لیے ایک مخلوط حکومت کے قیام کے سلسلے میں کررہا تھا۔افغانستان کے طالبان سے مذاکرات کی بات کچھ پرانی بھی ہے۔افغانستان میں جب طالبان کی حکومت تھی تو پاکستانی حکام باقاعدگی سے یہ بات کہتے تھے کہ ملاءعمر کے ماتحت طالبان کی قیادت اس قابل ہے کہ آزادانہ طور پر کام کرسکے اور یہ ضروری نہیں کہ افغانستان میں القاعدہ جیسے دہشت گرد گروپوں کی پشت پناہی کی جائے۔افغانستان میں اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کی اجازت اور عالمی سطح پر تسلیم کیے جانے کے بعد طالبان چاہیں گے کہ وہ جدت پسند پالیسیاں اختیار کریں۔چنانچہ اب پاکستان کا کہنا ہے کہ افغانستان میں عسکریت پسندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کی روشنی میں وہ سودے بازی کرانے کی انوکھی پوزیشن میں ہے تاہم کلنٹن حکومت کے دور میں طالبان کے ساتھ کام کا تجربہ رکھنے والے امریکی حکام نے اس سلسلے میں شدید اختلافی نکتہ نظر کا مظاہرہ

کیا جن کا کہنا ہے کہ وہ اس بات پر قائل نہیں ہو سکے کہ نئے طالبان پہلے سے کسی طرح مختلف ہوں گے۔

پاکستانی مستقبل کے تعین کے حوالے سے مختلف مسائل میں سے افغانستان سرفہرست ہے۔ یہ پاکستان کے امریکہ سے تعلقات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا پاکستان کی پشتون آبادی کے حوالے سے اپنا ایک اثر ہے اور افغانستان میں طالبان کی فتح پاکستان کے اسلامی انتہا پسندوں کے لیے ایک تہذیبی فتح کی طرح ہوگی۔افغانستان پاکستان اور بھارت کے تنازعے کا بھی مرکز ہے۔ستمبر2010ء میں پاکستانی فوجی حکام سے کی جانے والی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ مستقبل کے افغانستان کے حوالے سے ان کی جو سٹریٹجی ہے وہ زیادہ تعجب خیز ہے۔پاکستانی آرمی چیف جنرل کیانی جب یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم ایک جدید اور ترقی پسند ریاست بننا چاہتے ہیں تو ہم طالبانائزیشن کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں تو اصل میں ان کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر افغانستان میں طالبان فتح حاصل نہیں کرتے تو اس میں پاکستان کا زیادہ فائدہ ہے۔ان کی سوچ ان کے ان الفاظ سے اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ ''ہم پاکستان کے لیے جس چیز کی خواہش نہیں کرتے، افغانستان کے لیے بھی اس کی خواہش نہیں کر سکتے۔''لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو کیا پاکستان کی فوج طالبان کو کنٹرول کر سکتی ہے۔وہ جب کابل میں حکومت کر رہے تھے تو تعلقات بھی مشکل میں تھے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ طالبان اگر دوبارہ ابھرتے ہیں اور مغرب، اور کچھ اسلام پسندوں کے بقول، پاکستان میں اپنے مخالفین پر اخلاقی فتح حاصل کر لیتے ہیں تو وہ پاکستان کو نشانہ نہ بنائیں۔

اگر نظریاتی طور پر دیکھا جائے تو پاکستان کے لیے سب سے بہتر آپشن یہ ہوگا کہ وہ افغانستان کے معاملے میں بھارت کے ساتھ سٹرٹیجک تعاون کی پالیسی اختیار کرے تاہم پاکستان اور بھارت کی گہری دشمنی اور اس تعاون کو بڑھانے میں بڑی طاقتوں کی عدم دلچسپی کے باعث اس کا بھی امکان نہیں ہے۔ افغان پالیسی کے بارے میں امریکہ اور ایران کے درمیان تعاون بھی ناممکن دکھائی دیتا ہے حالانکہ نائن الیون کے حملوں کے بعد دونوں ملکوں نے ایک دوسرے سے خاصا تعاون کیا تھا جب ایران نے طالبان اور القاعدہ کے لیڈروں کو پکڑنے میں امریکہ کی مدد کی تھی۔

امریکہ

پاکستانیوں کا تاثر ہے کہ امریکہ نے پاکستانیوں کو بار بار استعمال کیا اور ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا۔امریکہ پر پاکستان سے بارہا بے وفائی کا الزام ہے جس کا آغاز1962ء میں بھارت چین جنگ کے موقع پر ہوتا ہے جب یہی امریکہ بھارت کو مجبور کر کے کشمیر پر کوئی سودے بازی کرا سکتا تھا۔1965ء کی جنگ ہوئی تو امریکہ نے پاکستان کی باقاعدہ امداد بھی روک دی جب بھارت نے عالمی سرحد کو پار کرلیا تھا۔1971ء کی جنگ میں بھی امریکہ نے پاکستان کو تنہا چھوڑ دیا جب پاکستان بھارت کی جارحانہ کارروائی کے نتیجے میں دو ٹکڑے ہوگیا۔پریسلر ترمیم کے تحت فوجی سپلائی منقطع ہونے اور افغانستان پر حملہ امریکی بے وفائی اور بے اعتباری کی تازہ ترین مثال ہے۔اس سے بھی پتہ چلا کہ پاکستانی صحیح کہتے ہیں کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان کے اعتماد کی شدید کمی ہے اور ایک بڑے فریق کے طور پر یہ امریکہ پر منحصر ہے کہ وہ اس بات کا مظاہرہ کرے کہ وہ ایک قابل اعتماد اور اچھا دوست ہے۔لیکن امریکہ کا رویہ تبدیل نہیں ہوا، چاہے وہ افغان پالیسی سے متعلق ہو یا امریکہ بھارت ایٹمی معاہدے کے حوالے سے ہو۔پاکستانی فوج افغانستان کی صورت حال اور امریکی غلطیوں کے حوالے سے اپنا نکتہ نظر پیش کرنے میں قطعاً جھجک کا مظاہرہ نہیں کرتی۔

بش کے دور حکومت میں امریکہ نے جنوبی ایشیا میں ایک غیر جانبدار پالیسی اختیار کی اور کہا کہ پاکستان اور بھارت کے حوالے سے امریکہ کی جو بھی پالیسیاں ہوں گی ان کی بنیاد دونوں ملکوں کے ساتھ میرٹ پر ہوگی اور اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا کہ امریکہ کے کس ملک سے تعلقات کیسے ہیں یا دونوں ملکوں کے درمیان سلامتی کی صورت حال کیسی ہے۔ایشلے ٹیلیز کا کہنا ہے کہ بھارت ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے طور پر اس قابل ہے کہ امریکہ کے ساتھ اس کے سٹرٹیجک تعلقات کو بڑھایا جائے۔اس کے برعکس پاکستان کو سافٹ لینڈنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔نائن الیون کے حملوں اور پاکستان کی مرکزی نوعیت سے سافٹ لینڈنگ میں فرق آ گیا ہے۔تاہم غیر جانبداری کی چھتری تلے امریکہ نے بھارت کے ساتھ تعلقات کو ٹرانسفارم کیا جس میں امریکہ اور بھارت کے درمیان ایٹمی معاہدہ ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

بھارتی طاقت کو بڑھانے کے لیے امریکہ کے عزم کو پاکستان چوکنا ہوکر دیکھتا ہے۔فوج اور کئی سویلین سٹرٹیجیز کے حوالے سے یہ شواہد ملتے ہیں کہ علاقائی اتحادی کے طور پر امریکہ نے پاکستان کے مقابلے میں بھارت کو چن لیا ہے۔یہ تصور نائن الیون کے بعد سے امریکہ کی جانب سے پاکستان کو دی جانے والی بھاری امداد اور پرکشش امدادی پروگراموں سے بھی بمشکل ہی کمزور پڑتا ہے۔امریکہ نے پاکستان کو وسیع تر تعلقات کے نام پر بھارت کی طرح سٹرٹیجک مذاکرات کی پیشکش کرکے بھی لبھانے کی کوشش کی جس کے لیے پاکستان کو بار بار کہا جا چکا ہے تاہم پاکستان کی جانب سے امریکہ کے ساتھ قریبی تعلقات کے تصور کی مزاحمت کی جارہی ہے اور پاکستان یہ بات جانتا ہے کہ امریکہ کی پاکستان کے ساتھ کمٹمنٹ مختصر مدتی ہے جس کا انحصار افغانستان کی صورتحال پر ہے۔دوسری جانب امریکہ کا کہنا ہے کہ اس کے بھارت کے ساتھ تعلقات سے پاکستان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔پاکستان میں یہ بات ناقابل فہم سمجھی جاتی ہے۔امریکہ پاکستان کے لیے ایسا کوئی نیا اور بڑا آئیڈیا لانے سے قاصر ہے جو کہ وہ بھارت کے لیے لاچکا ہے۔جب تک امریکہ ایک بامعنی اورنئی (ممکنہ طور پر سیاسی) گاجراور ڈنڈے کی پالیسی کو آگے نہیں بڑھا سکتا اور اس کام کے لیے سیاسی عزم قائم نہیں کرسکتا تب تک وہ ممکنہ طور پر پاکستان کو بحران سے نکالنے سے قاصر ہوگا۔ہم اس مستقبل کو ذیل میں پالیسی کے شعبے میں مزید زیر بحث لائیں گے۔

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات قابل پیش بین مستقبل تک خرابی سے دوچار رہیں گے۔امریکہ کے نکتہ نظر سے بات کی جائے تو اس کی جانب سے صبر کا مظاہرہ کیا جارہا ہے جو کہ پاکستان کی کرپشن، اس کے سول ملٹری تعلقات میں عدم توازن، افغان طالبان کے لیے اس کی مدد اور پاکستان میں موجود دہشت گرد گروپوں کے ساتھ اس کے مثبت رویے اور بعض کیسوں میں تو پاکستان حکومت کی جانب سے ان کی حمایت کے حوالے سے اس میں ہے۔امریکہ اور پاکستان افغانستان کے حوالے سے دباؤ اور جوابی دباؤ کا بے ثمر کھیل کھیل رہے ہیں۔پاکستانی فوج افغانستان کے سیاسی تھیٹر پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے کے لیے پرعزم دکھائی دیتی ہے اور جب بھی امریکہ کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پراسرار طور پر امریکہ کو پتہ چلتا ہے کہ افغانستان کو سپلائی لے کر آنے والے راستے بند کیے جاچکے ہیں۔اگرچہ 2005ء سے ان سپلائی روٹس پر انحصار 80 فیصد تک کم ہوچکا ہے اور ضروری آلات اور سپلائی

جیسے ہتھیار وغیرہ ہوائی راستے سے لائے جاتے ہیں تاہم پٹرول اور بلک سپلائی کے لیے یہ راستے بدستور اہمیت کے حامل ہیں۔

مزید یہ کہ اسلام پرست جس طرح اپنے تصورات کو مسلم معاشروں میں پھیلانے کے قابل ہو چکے ہیں اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مغربی پالیسیوں کو کس طرح دیکھا جارہا ہے۔جیسا کہ معید یوسف کہتے ہیں کہ اگر مغربی ایجنڈوں کو مختصر مدتی مفادات کے لیے چلایا جاتا رہا اور پاکستان کے لوگ یہ دیکھتے رہے کہ انہیں سودے سے نکالا جارہا ہے تو اس مائینڈ سیٹ کو ایندھن ملتا رہے گا جسے کہ سب سے پہلے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ پاکستان میں جڑیں رکھنے والے کسی مزید دہشت گرد حملے اور مغربی مفادات اور افراد کو ہدف بنائے جانے کے خطرے کے حوالے سے مزید صبر کا مظاہرہ نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ افغانستان کے لیے امریکی پالیسی کے حوالے سے شدید شکوک وشبہات کی شکار ہے اور ایٹمی اور انٹیلی جنس شیئر نگ کے حوالے سے سخت مزاحمتی رویہ رکھتی ہے۔جیسا کہ وکی لیکس کی کئی کیبلز سے پتہ چلتا ہے اور کئی انٹیلی جنس رپورٹس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان یہ سمجھتا ہے کہ انٹیلی جنس کا قریبی تعاون خود پاکستان کے خلاف استعمال ہوسکتا ہے بالخصوص اگر اس حوالے سے پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کی سیکورٹی کی بات کی جائے تو یہ بہت نازک ہے یا کہ امریکہ دہشت گرد حملوں کے حوالے سے انتہائی نازک قسم کی معلومات بھارت کے حوالے کرسکتا ہے جیسا کہ اس نے ڈیوڈ ہیڈلی کے لیے بھارت کو رسائی دینے کی صورت میں کیا جو کہ پاکستانی نژاد امریکی ہے اور ممبئی حملوں میں مرکزی کردار کا حامل ہے۔

2010ء کے اواخر تک پاکستانی رائے چاہے وہ سرکاری ہو یا کوئی اور قسم کی، کے حوالے سے کوئی قابل بھروسہ اشارے موجود نہیں تھے کہ وہ امریکی عزائم اور افعال کے حوالے سے کم شکوک وشبہات کے حامل ہیں۔

پاکستان کے لیے سب سے نقصان دہ واقعہ جو ہوسکتا ہے وہ پاکستان سے امریکہ پر کیا جانے والا کوئی حملہ ہوسکتا ہے۔ٹائم سکوائر پر بم حملے (جو ایک ایسا واقعہ کہا جاتا ہے جس کی منصوبہ بندی پاکستان میں کی گئی اگرچہ اس میں ایک امریکی شہری کو استعمال کیا گیا اور جس کے بارے میں شاید پاکستانی حکام کو علم تھا) جیسا کوئی اور حملہ ہونے کی صورت میں پاکستان

کوعوامی یا کانگرس کی صورت میں سخت سزا دی جاسکتی ہے یا اس کی امداد بند کی جاسکتی ہے۔

پاکستان اور امریکہ کے درمیان بحران کسی اور وجہ سے بھی پیدا ہوسکتا ہے۔دسمبر 2010ء کے اواخر میں افغان ملیشیا گروپ پاکستان میں بھیجے جانے کے منصوبے کی اطلاعات تھیں تاکہ وہ پاکستانی علاقے میں کام کرنے والے گروہوں بشمول تربیتی مراکز پر حملہ کرسکیں۔یہ وہاں پر بہت کم ہے لیکن ڈرون حملوں کی شکل میں پاکستان میں بڑے پیمانے پر امریکہ کی جانب سے حملے کیے جارہے ہیں۔یہ اور ملشیا گروپ القاعدہ، پاکستان میں مقیم افغان طالبان اور دیگر گروپ جیسے حقانی نیٹ ورک اور گلبدین حکمت یار، جوکہ پاکستان میں مقیم ہیں لیکن اصل میں افغان سیاسی اتحاد کا حصہ ہیں، کونشانہ بناسکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ایسے مشن ہوسکتے ہیں جو پاکستان میں دہشت گردوں کے تربیتی مراکز کو نشانہ بنانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں جہاں امریکہ کے تربیت یافتہ گروہ اور افراد ایک یا ایک سے زیادہ،بشمول پاکستان میں موجود افغانیوں کے، اہداف حاصل کریں۔

ان معاملات میں کمتر نوعیت کی شکایات، جیسے ٹیکسٹائل کوٹے کے لیے پاکستان کو پسندیدہ ملک قرار دینے سے انکار کا مسئلہ ہے، غیرمتعلقہ بن جائیں گی اور پاکستانی علاقوں پر ڈرون کے ذریعے حملوں کے امکانات بڑھ جائیں گے جوکہ خود پاکستان کے بارے میں امریکی پالیسی میں تبدیلی کا اشارہ ہوں(اس سلسلے میں متبادل پالیسی کے حوالے سے بحث ذیل میں ملاحظہ کریں)۔

جی ہاں، پاکستان امریکہ کوتنہا کرنے کا بمشکل ہی متحمل ہوسکتا ہے۔پاکستان کی فوج کو امریکہ کی جانب سے جو جدید ہتھیار اور تربیت فراہم کی جاتی ہے اور بجٹ کے سلسلے میں جو معاونت اور جو معاشی امداد دی جاتی ہے اس کا کوئی متبادل موجودنہیں ہے۔اس کے علاوہ دیگر ذرائع سے مدد حاصل کرنے میں بھی امریکہ پاکستان کامددگار ہے۔ایک زیادہ آزاد امریکی تجارتی پالیسی پرائیویٹ سیکٹر کی براہ راست سرمایہ کاری اور ملازمتوں کی تخلیق میں بڑے پیمانے پر اثرات کی حامل ہوسکتی ہے اور یوں پاکستان میں جمہوری حکومت کومضبوط بنانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔بھارت کوکشمیر اور دیگر معاملات پر مذاکرات کی میز پر لانے کے لیے بھی پاکستان امریکہ کی جانب سے دباؤ ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے اور بھارت کے ساتھ کسی بحران کی صورت میں امریکی اور برطانوی سفارت کاری پر انحصار کرتا ہے۔اگرچہ

پاکستان میں مقامی سیاست پر اثر انداز ہونے کے لیے امریکہ کے پاس تھوڑے ہی پالیسی انسٹرومنٹس ہیں تاہم ان کے دوطرفہ تعلقات باقاعدگی کے ساتھ اندرونی بحث کا حصہ بنتے رہتے ہیں جو کہ کسی حکومت کو کمزور یا طاقت ور کرتے ہیں۔

پاکستان کی عوام اور اشرافیہ میں امریکہ کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے اعتماد کی کمی کی بات کی جاتی ہے جو اشتراک عمل پر اثر انداز ہوتی رہے گی۔امریکہ کی جانب سے اسرائیل اور بھارت کے ساتھ تعلقات اوراس کے ذریعے پاکستان کو ایٹمی طاقت سے محروم کرنے کی سازشی تھیوریاں بھی بڑے پیانے پر،حتیٰ کہ فوج کے اعلیٰ ترین حلقوں میں بھی، چلتی رہتی ہیں۔عسکریت پسندی کے باعث لاحق خطرات کے بارے میں سمجھنے کے باوجود پاکستانیوں کی بڑی تعداد سمجھتی ہے کہ شمال مغربی سرحدی علاقے میں بڑھتی ہوئی بنیاد پرستی کی وجہ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف پالیسیوں اور افغانستان میں جاری آپریشنوں کا براہ راست نتیجہ ہے۔آبادی کا دسویں سے بھی کم حصہ امریکہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے اوراس سے دوگنے پاکستانی سمجھتے ہیں کہ امریکہ پاکستان کی سلامتی کے لیے بھارت سے زیادہ بڑا خطرہ ہے۔پاکستانیوں کے ان خیالات کو بدلنے کے لیے جو منصوبے ہیں وہ بہت طویل مدتی ہیں جن کے تحت امریکہ تجارت یا ایٹمی معاملات پر پاکستان سے معاہدے کرے گا جن کا اگلے کئی سالوں تک کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔

چین: جنوبی ایشیا کی نئی طاقت

چین منظم طریقے سے جنوبی ایشیا میں اپنے کردار کو بڑھا رہا ہے جو کہ پاکستان سے زیادہ اور کہیں نہیں ہے جہاں کہ چین ایک غالب بیرونی طاقت ہے۔ملک کی اشرافیہ اور اکثر صوبوں میں اس کی مقبولیت، اس کا پاکستان میں معاشی پھیلاؤ اور جنگی ہتھیاروں اور ایٹمی ٹیکنالوجی کی صورت میں سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کے لیے اس کی جامع امداد سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں اس کا عمل دخل مزید بڑھ رہا ہے۔اس کی علامتی عکاسی دسمبر2010ء میں چینی وزیراعظم وین جیاباؤ کا دورہ پاکستان ہے جہاں تین روز کے دوران لگ بھگ 35 ارب ڈالر کے امدادی اور تجارتی معاہدوں پر دستخط کیے گئے اور چین کے لیے پاکستان کی اہمیت کے بارے میں وہی مخصوص قسم کے بیان دیے گئے۔تمام پریس رپورٹس اور تبصروں سے پتہ چلتا

ہے کہ پاکستانیوں کے نزدیک امریکہ کے مقابلے میں چین کے ساتھ معاملات طے کرنا کس قدر آسان ہے کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ امریکہ پاکستان کے ساتھ کس قسم کے غیرمناسب مطالبات کرتا ہے جن میں خیبرپختون خواہ کے حوالے سے پہلے ہی حد سے زیادہ پھیلی پاکستان فوج سے غیرحقیقی مطالبات بھی شامل ہیں۔

پاکستانیوں کی جانب سے جس طرح کے الفاظ کا استعمال کیا گیا وہ اس بات کی عکاسی کرتا تھا کہ ان کے لیے چین کے ساتھ تعلقات کس قدر اہمیت کے حامل ہیں اور امریکہ ان کے لیے کس قدر ناقابل اعتبار ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں بھارت بھی شامل ہے۔مزید یہ کہ چینی بھی یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ پاکستانیوں کے ساتھ معاملات کس طرح طے کرنے ہیں جس کے ساتھ وہ خوشگوار جذبات کا اظہار تو کھلے عام کرتا ہے لیکن جن معاملات پر اسے پاکستان سے اختلاف ہے ان کے بارے میں خاموشی سے معاملہ اٹھاتا ہے جیسا کہ چینی صوبے سنکیانگ میں اوغور مسلمانوں کے حوالے سے عسکریت پسندی کا مسئلہ ہے جن کے بارے میں الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان عسکریت پسندوں کو پاکستان میں تربیت دی جاتی ہے۔ایک طاقتور اور مقابلے کے لیے صف آرا چین کا ابھرنا جس کی معیشت بہت مضبوط ہے بشمول پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعے کی موجودگی کا مطلب ہے کہ مغلوں نے جنوبی ایشیا میں جو سٹریٹیجک اتحاد پیدا کیا تھا اور جسے انگریزوں نے قائم رکھا تھا، وہ اب ختم ہو چکا ہے۔

تاہم عالیشان بیان بازی سے قطع نظر پاکستان کے بڑھتے ہوئے سلامتی کے بحران کے حوالے سے چین کی پریشانی بڑھ رہی ہے۔چین اس وقت افغانستان میں سب سے بڑا براہ راست غیرملکی سرمایہ کار ہے اور پاکستان، ایران اور وسطی ایشیا میں بھی قابل زکر حد تک سرمایہ کاری رکھتا ہے۔پاکستان کی جانب سے اسلامی پراکسی کے استعمال پر اس کی پریشانی بے جا نہیں۔اس کے علاوہ خود چین کے شورش زدہ اوغور مسلمان پاکستان اور افغانستان میں تربیت حاصل کررہے ہیں۔ بھارت کے بطور فطری تجارتی پارٹنر کی جگہ چین نے لے رکھی ہے جس کی وجہ معاشی نہیں بلکہ سیاسی حالات ہیں۔

سٹرٹیجی کی بنیاد پر بات کی جائے تو چین کی جانب سے یہ امکان نہیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ فوجی تعلقات کو ختم کرے گا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ بھارت کو جنوبی ایشیا کی بڑی طاقت

بننے سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی طاقت کے توازن کو بہتر بنایا جائے۔مزید براں یہ کہ جیسا کہ پاکستان کے شہروں میں اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ چینی حکام اور تاجر یہ بات جانتے ہیں کہ پاکستانیوں سے کس طرح کام لینا ہے۔امریکہ کے مقابلے میں چینی اپنی تنقید کھلی کے بجائے مخفی رکھتے ہیں۔سیاست دانوں اور جرنیلوں کے لیے چین ایک کھلا میدان ہے جو کہ چین کے ساتھ تعلقات مزید بہتر بنانے کے لیے وہاں کے تواتر کے ساتھ دورے کرتے ہیں۔صرف ایک میدان میں دونوں ملکوں کے تعلقات میں کچھ کمی دکھائی دیتی ہے: ان کے لیے موقع کی پہلی سرزمین چین کے بجائے خلیجی ممالک، یورپ اور امریکہ ہیں۔

بھارت

پاکستان کے مستقبل کے تعین کے لیے بھارت ایک مستقل اور امکانی منفی عنصر ہے۔پاکستان بہرحال ایک ایسا ملک ہے جو کہ بھارتی مسلمانوں کی تحریک کے نتیجے میں عمل میں آیا اور اگر اس کا بہترین تاریخی تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کی تخلیق کم وبیش ایک حادثہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ بھارت پاکستان کے جائز مطالبات کے ضمن میں بھی کم دلچسپی دکھاتا ہے اور یوں پاکستانیوں کو اور بھی زیادہ جنونی بناتا ہے۔

پاکستانیوں کی اکثریت اب بھی بھارت کو بڑا خطرہ اور امریکہ کو ایک دشمن سمجھتی ہے۔2010ء کے ایک پیوسروے کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی طالبان اور القاعدہ کے حوالے سے سب سے کم تشویش رکھتے ہیں اور جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ کون ہے، بھارت، طالبان یا القاعدہ، تو 53 فیصد نے بھارت کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا جبکہ 23 فیصد نے طالبان اور صرف تین فیصد نے اس سلسلے میں القاعدہ کا نام لیا۔72 فیصد نے بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور 75 فیصد نے بھارت کے ساتھ تجارت اور مذاکرات کے عمل کو بڑھانے کی حمایت کی۔امریکہ کے لیے پاکستانیوں میں حمایت کم ترین سطح پر تھی۔59 فیصد پاکستانیوں نے امریکہ کو اپنا دشمن قرار دیا جبکہ صرف آٹھ فیصد نے صدر بارک اوبامہ پر اعتماد کا اظہار کیا۔

پاکستان میں بھارت کے حوالے سے پالیسی کے بارے میں فوجی ڈکٹیشن کا عمل

جاری رہے گا جو کہ اہم ایشوز پر کسی قسم کی لچک دکھانے پر تیار نہیں جبکہ دوسری جانب سے بھارت کے اندر موجود سخت گیر رویہ بھی پریشانی کا ایک بڑا باعث ہے۔ بھارت کے حوالے سے فوج کا رویہ عوامی رویے کے ساتھ مل کر پیچیدہ شکل اختیار کر لیتا ہے جو کہ یہ ہے کہ بھارت صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے جو کہ ایک ایسا رویہ جس کا نتیجہ ایک سیاسی تباہی کی صورت میں برآمد ہو چکا ہے جب1999ء میں کارگل کا واقعہ پیش آیا تھا۔

سوچ میں ایک قابل زکر تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ فوج میں کچھ لچک پیدا ہو۔ ایک طاقت ور سیاسی قیادت ہو اور خودمختار ذہن کے ساتھ کام کرنے والے وزراء خارجہ ہوں جو کہ اب تک مشکوک انداز میں غائب ہی رہے ہیں۔ مسئلہ کشمیر کا ایک حقیقی حل یا دونوں ریاستوں کے درمیان دیگر تمام مسائل کے حل کا ابھی کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

ایک مناسب امید یہ کی جاسکتی ہے کہ اس معاملے کو جوں کا توں رکھا جائے جو کہ گذشتہ کئی سالوں کے دوران اس قدر خراب عمل بھی نہیں رہا لیکن اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی نئے سانحے سے بچا جائے جیسا کہ بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ یا ممبئی حملے کا واقعہ تھا۔ اگر بھارتی سیاسی جذبات اجازت دیں تو کشمیر کے حوالے سے تیز رفتاری کے ساتھ اعتماد سازی کے اقدامات (سی بی ایمز) کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن پاکستان میں ایک حقیقی اور مستقل تبدیلی کا انحصار فوج کے کردار میں بنیادی حد تک کی اور ممکنہ حد تک اس بات پر ہوگا کہ جذبات کی سطح پر ایک جنریشنل تبدیلی لائی جائے۔ ممبئی حملوں جیسے مزید کسی واقعے کے نتائج و اثرات ممکنہ حد تک منفی ہوں گے اور یہ بات بھی اس قدر بلا جواز نہیں کہ ممبئی حملے پاک بھارت مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کے لیے کرائے گئے تھے۔ اگرچہ ایک نئے بحران کی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی لیکن ساتھ ہی حالات معمول پر آنے کی بھی کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت موجود سرد مہری کی صورت حال اور مختلف ایشوز پر کسی نئی پیش رفت کا نہ ہونا ممکنہ طور پر ایک نارم کے طور پر رہے گا۔ بلکہ بحران کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان میں قوم پرستی کے جذبات مضبوط ہوں گے بلکہ ملک کے جہادی اور دیگر انتہا پسند گروپوں کی کریڈیبلیٹی بھی مضبوط ہوگی۔

پاکستان کے بھارت کے ساتھ تعلقات کی تنظیم سازی ملک کی سویلین اور فوجی لیڈر شپ کے درمیان تنازعے کا باعث اور حکومتوں کی تبدیلی کی ایک بڑی وجہ ثابت ہو چکی ہے

کہ فوج سمجھتی ہے کہ سویلینز کئی مواقع پر بھارت کے لیے بہت نرم رویہ رکھ چکے ہیں اور ان کو ہٹانے کی یہی وجہ تھی۔اس کے علاوہ صوبوں کے درمیان کشمیر کے حوالے سے تعلق میں بھی فرق پایا جاتا ہے کیونکہ کشمیر کے حوالے سے پنجاب کا رویہ بہت عقابی ہے جبکہ سندھ اور بلوچستان جیسے صوبے کشمیر کے ساتھ اس قدر دلچسپی نہیں رکھتے۔ بھارت کے ہاتھوں پاکستان کی شرمناک شکست جیسے کہ 1971ء میں ہوئی تھی اور ملک ٹوٹ گیا اس جیسی ایک اور شکست اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا معاشی اور انسانی بحران پاکستان کی یکجہتی کے لیے ایک امتحان ثابت ہوسکتا ہے تاہم دونوں کی برابر کی تباہی اور ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کے باعث ایسی شکست کا امکان کم ہے۔

جیسا کہ ایکویشن کے بھارتی موقف کے بارے میں سی کرسٹائن فیئر اپنے بیلاجیو پیپرز میں لکھتی ہیں:

بھارت پاکستان کے حوالے سے ایسی کسی بھی پالیسی کی تیاری، بشمول دہلی اور سری نگر کے درمیان کوئی جامع سودے بازی کرنے کے، میں پس وپیش سے کام لیتا ہے جو کہ مصالحتی ہو۔ بھارت اپنے اس موقف پر ہی اٹکا ہوا ہے کہ اس کے مختلف الیکشنوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔تاہم کشمیر میں جانے والا کوئی بھی شخص اس بات کی تصدیق کرے گا کہ الیکشن سے کشمیریوں کی دہلی کے حوالے سے ناراضگی اور بے چینی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کشمیر کے حوالے سے بھارت نے ''وقت گذارو'' کی حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے۔

جیسا کہ متعدد بھارتی سٹرٹیجسٹ کہتے ہیں کہ کشمیر اور دیگر کئی مسائل کے بارے میں سخت گیر پالیسی اختیار کر کے بھارت خود اپنے مفادات کا دائرہ بڑھانے میں چین کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ بھارتی قیادت بالخصوص جس کا تعلق وزارت خارجہ اور فوج سے ہے، جنوبی ایشیا کی سٹرٹیجک یک جہتی کو تباہ کرنے کے مرتکب ہیں اور اس بات کو یقینی بناتے رہے ہیں جس طرح پاکستان زوال کی طرف جارہاہے، یہ بھی اس کے ساتھ جاتے رہیں گے۔

ولیم میلام اپنے بیلاجیو کے تجزیے میں ایک ایسے منظر نامے کے بارے میں قیاس آرائی کرتے ہیں جس کے تحت پاکستان اور بھارت اپنے تعلقات کو معمول پر لے آتے ہیں اور اس کا آغاز افغانستان سے ہوتا ہے۔میلام اور بیلاجیو کے دیگر شرکاء کے مطابق پاکستان کو

ایک جدید معاشرہ اور ریاست بننے کے لیے بھارت کے ساتھ امن اور معمول کے تعلقات کی ضرورت ہے۔تاہم حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایک تاریک منظر نامہ بھی ہے جو اگلے بارہ تیرہ سال کے دوران سامنے آسکتا ہے جس میں ایٹمی ٹکراؤ بھی ہوسکتا ہے یا کم ازکم دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو نقصان پہنچا کر زچ کرنے کا ماحول برقرار رہ سکتا ہے۔

جب بھارت کی بات کی جائے تو سب سے بڑا جو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا بھارتی خطرے کے حوالے سے پاکستانی فوج کا فہم کچھ مختلف ہوگا اور آیا کہ بھارت خود بھی تعلقات کو معمول پر لانے کے عمل کو سنجیدگی سے لے گا۔کئی بار یہ چیز سامنے آچکی ہے کہ پاکستان اپنے اس بڑے ہمسائے کے حوالے سے کچھ تحفظات رکھتا ہے لیکن وہ قابل بھروسہ یقین دہانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے کہ بھارت اپنی غالب حیثیت کا فائدہ نہیں اٹھائے گا۔کسی حد تک دیکھا جائے تو کسی حل کی تلاش کی صورت میں پاکستان اس وقت زیادہ فائدے میں رہے گا بجائے اس کے کہ وہ مزید کمزور اور بھارت مزید طاقت ور ہوجائے۔تاہم پاکستان میں کچھ لوگ اب بھی سمجھتے ہیں کہ ایٹمی تصادم کے خطرے کی آڑ لے کر دہشت گردی کو استعمال کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ توازن قائم رکھا جائے گا جو کہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جو کئی سالوں پرانی ہے۔تاہم اس سے کشمیریوں کو فائدہ ہوگا نہ پانی کا مسئلہ حل ہوگا اور نہ ہی دونوں ملکوں کے مفاد کے حامی ٹرانزٹ کے راستوں کو کھولا جائے گا۔پاکستان میں بھارت کے بارے میں گذشتہ پانچ سال کے دوران رویہ بدل چکا ہے تاہم فوج میں اس کے بہت کم آثار دکھائی دیتے ہیں حالانکہ فوج اچھی طرح جانتی ہے کہ اسے اب ایک نئے خطرے کا سامنا ہے جو کہ طالبان کی شکل میں ہے جس کے کئی ایسی دوسری طاقتوں سے تعلقات ہیں جو کہ ایک جدید پاکستان کے تصور کو تباہ نہیں تو تبدیل ضرور کرنا چاہتے ہیں۔

عالمگیریت اور ایٹمی ہتھیار

دو دیگر بیرونی رجحانات ایسے ہیں جو پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے اپنا کردار ادا کریں گے۔اول گلوبلائزیشن یا عالمگیریت ہے۔یعنی تصورات، لوگوں اور اشیاء کی زیادہ تیز ترین اور شدید ترین حرکت، جو کہ ایک ایسا عمل ہے جس نے گذشتہ تیس سال کے دوران

MashalBooks.org

بہت تیزی سے اپنی رفتار بڑھائی ہے۔دوئم، پاکستان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے ایٹمی ہتھیا رہیں جنہیں شاید لگتا ہے کہ مالی بحران یا سٹرٹیجک لاجک سے بھی متاثر نہیں ہونے دیا جارہا ہے۔یہ باہم منسلک ہیں۔پاکستان نے اپنی تمام تر ایٹمی ٹیکنالوجی دیگر ممالک سے حاصل کی اور گلوبلائزیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک پرچیزنگ کا نیٹ ورک تخلیق کیا جو کہ دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ بعد میں اس نے اپنے ان نیٹ ورکس کو دیگرکئی گاہکوں کے ساتھ ایٹمی ٹیکنالوجی شیئر کرنے میں استعمال کیا۔

موجودہ زمانے کی گلوبلائزیشن کو عام طور پر تجارت کے زبردست پھیلاؤ، ٹیلی کمیونی کیشنز اور طویل فاصلوں تک لوگوں کی تیزرفتار نقل وحمل کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔پاکستان ایک ایسا ملک ہے جوگلوبلائزیشن کے اس جدید ترین حملے کے لیے سب سے کم تیار تھا۔اس نے تعلیم پرسنگین حد تک کم سرمایہ کاری کی اور اس کی اکانومی ایسی ہے جو کہ ایسی چیزیں اور سروسز تیار کرنے سے قاصر ہے جن کی بہت زیادہ ڈیمانڈ ہو۔مزید یہ کہ یہ دنیا بھر کے ہر قسم کے جہادیوں کے لیے ایک ہدف، ٹرانزٹ لاؤنج اور تربیتی مرکز بن چکا ہے۔پاکستان اوراس کے کچھ اتحادیوں جیسے امریکہ اور سعودی عرب نے ان جہادیوں کی پشت پناہی کی جن میں سے بہت سوں نے مقامی جڑوں کوہی کھوکھلا کرنا شروع کردیا۔آخر میں یہ ہوا کہ پاکستان کوغیرملکی امداد کا نشہ پڑگیا جس نے کبھی اپنی معیشت میں کسی قسم کی اصلاحات نہیں کیں۔اس شعبے میں پاکستان کے دوستوں نے بھی اس نشے کی حمایت کی۔

لوگوں، اشیاء اور تصورات کی تیز رفتارنقل وحرکت کے ساتھ کمیونزم کا خاتمہ عمل میں آیا جو کہ نوجوان اور غصہ ور لوگوں کے منظم ہونے کا ایک اصول تھا۔اس کے نتیجے میں دبائی گئی مقامی قوتوں کو باہر آنے کا موقع ملا۔ مذہبی تشخص کی لہر بھی پھوٹ پڑی جس کا آغاز یوگوسلاویہ سے ہوا جو بڑھتی ہوئی سوویت یونین اوراس سے بھی آگے کونکل گئی۔سیکولر انقلابی تحریکیں جیسے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کو اسلامی گروپوں کی جانب سے چیلنج کا سامنا ہوا۔مذہب کی بات کی جائے تو یہ پاکستان کے قومی تشخص کا حصہ بن چکا ہے اور یہ اسی سمت میں بڑھ رہا ہے۔بائیں بازو کی غیر موجودگی سے خالی ہونے والی جگہ کو اسلامی عسکریت پسند تنظیموں اور جماعتوں نے بھر دیا ہے۔پاکستان کے شیعہ اور سنی دونوں ایرانی

انقلاب سے متاثر ہیں جو کہ پہلا جدید انقلاب تھا جس کا تعلق بائیں بازو کے بجائے مذہب سے تھا۔اس طرح مشرقی پاکستان بعدا ز سامراج پہلی کامیاب اندرونی بغاوت تھی جس کی بنیاد نسلی قومیت پر تھی اگرچہ اسے کسی حد تک بھارت کی مدد بھی حاصل تھی۔ پاکستان میں بنگالیوں کے بعد جو دوسری سیکولر علیحدگی پسند تحریک شروع ہوئی وہ بلوچوں کی تھی جبکہ سندھی اور مہاجر بھی پاکستان سے علیحدگی کے امکانات پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔

جہاں تک ایٹمی ہتھیاروں کا تعلق ہے تو اگر اس امر کو دیکھا جائے کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلح افواج کا غلبہ ہے اور جو ہر وقت اپنے ایک بڑے ہمسائے کے ساتھ جنگ کے دہانے پر رہتا ہے لہٰذا ایسی صورت حال میں یہ بات باعث حیرانی نہیں کہ جنگی تنازعہ یا جنگ کی حقیقی شکل بدلنے سے پاکستان متاثر ہوا ہے۔ جہاں بھی ایٹمی ہتھیار آجاتے ہیں تو دو صنعتی ریاستوں کے درمیان ایک منظم جنگ کی شکل میں جدید ترین اور تباہ کن ہتھیاروں کے استعمال کا تصور مشکل سے ہی کیا جاسکتا ہے۔

ایٹمی ہتھیار پاکستان اور بھارت کے درمیان حقیقی معنوں میں امن قائم نہیں رکھ سکے لیکن ان کی موجودگی سے یہ بات یقینی ہوگئی ہے کہ کوئی عقلمند رہنما کبھی ان کو استعمال نہیں کرے گا۔ان کی وجہ سے ایک بڑے پیمانے کی کلاسیکی طرز کی صنعتی جنگ کا امکان موثر طریقے سے ختم ہوگیا ہے۔تاہم خارجی امکانات کی وجہ سے کسی حادثے کا خطرہ بدستور موجود ہے یا کوئی جنونی شخص کسی بھی ملک میں اقتدار میں آجائے۔تاہم بڑا بیرونی خطرہ ان ہتھیاروں کی چوری کا ہے اوراس سے بھی بڑا بیرونی خطرہ سیاسی مقاصد یا محض لالچ کی خاطر ایٹمی ٹیکنالوجی حتیٰ کہ مکمل ہتھیار منتقل کرنے کی دانستہ کوشش کا ہے اور یہ ایک ایسا کلب ہے جس کا پاکستان بھرپور طریقے سے رکن بن چکا ہے۔

ایٹمی ہتھیار پاکستان کے لیے جس طرح اہم ہیں اسی طرح شمالی کوریا کے لیے بھی بہت قیمتی ہیں۔ان کی موجودگی سے ان میں بقاء کی ضمانت قائم رہتی ہے۔شمالی کوریا کی طرح پاکستان بھی ایٹمی ملک ہونے کے باوجود ناکام ہوچکا ہے۔ پاکستانی ایٹمی پروگرام کے ایک اہم رہنما ثمر مبارک مند نے حال ہی میں دنیا کو یاد دلایا کہ اگر پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار نہ ہوتے تو شاید وہ کارگل کے واقعے، پارلیمنٹ پر حملے یا ممبئی حملوں کے بعد باقی نہ رہتا۔ یقیناً اگر پاکستان ایٹمی ہتھیار حاصل نہ کرتا،تو کیا پھر وہ ایسی اشتعال انگیز سٹرٹیجیز بناتا جو

MashalBooks.org

بھارت کو کسی قسم کے فوجی ایکشن پر غور کرنے کا سبب بنتیں؟

منظر نامہ اور نتائج

منظر نامے ایک ممکنہ مستقبل کا ایک شاندار منظر پیش کرتے ہیں اور ایسے مخفی انٹرا ایکشنز پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جو کہ ایک مخصوص پالیسی کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ فیصلہ سازوں کی مدد کرتے ہیں کہ وہ روایتی سوچ سے گریز کریں اور حال سے مستقبل کو سیدھے خطوط کی روشنی میں دیکھیں۔ ہم نے اس اپروچ کا استعمال 2004ء میں کیا تھا۔ یہاں پر ہم سات منظر نامے پیش کر رہے ہیں جس کے بعد ہم ان کے عوامل کے درمیان تعلق پر بحث کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان میں سے کون سا کس پر غالب آتا ہے۔

مزید اگلے پانچ سال: ایسے ہی چلتا رہے گا

یہ مزید اگلے پانچ سال سے سات تک پاکستان کا مستقبل ہوسکتا ہے۔ فوج بنیادی کردار ادا کرے گی جو اگرچہ ہمیشہ کی طرح اور ضروری طور پر ریاست اور سیاسی فیصلہ سازی میں مرکزی نہیں ہوگا۔ منظر نامے میں براہ راست فوج راج یعنی مارشل لاء بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ بیلاجیو کے متعدد شرکاء کا کہنا ہے کہ اس بات سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ پاکستان میں فوج کی حکومت ہوتی ہے یا سویلین، کہ دونوں کے ہی کچھ مثبت پہلو ہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کو ریاستی اور قومی طور پر اس مقام پر پہنچانے میں بھی دونوں کا ہی کردار ہے۔

اس منظر نامے میں سیاسی نظام کو کچھ مخصوص پیرامیٹرز تک محدود کر دیا جائے گا: فوج قبضہ کرلے گی لیکن ایسا عارضی طور پر ہوگا۔ یہ بڑے پیمانے پر اصلاحات کی حوصلہ افزائی کرے گی نہ اس کو برداشت کرے گی اور سویلینز کے پاس بس ایک محدود سیاسی کردار ہوگا۔ سیاسی نظام کو درمیان میں ہی منجمد کر دیا جائے گا۔ بھرپور جمہوریت اور فوجی آٹوکریسی کے درمیان گرے زون قائم ہوجائیں گے۔ ریاست ہمیشہ ٹرانزیشن میں رہے گی لیکن اپنی منزل پر نہیں پہنچے گی اور حامیوں اور نقادوں کو پریشان کرے گی۔ اس منظر نامے میں سویلین حکومت گورننس کے معاملات کو سنبھالنے کے معاملے دباؤ میں رہے گی جیسے فرقہ وارانہ تشدد، معاشی اور توانائی کے مسائل وغیرہ، اور اس طرح درپردہ فوجی افسران سرگرم رہیں

گے۔طاقت کے نئے مراکز جیسے عدلیہ جمہوری اثرات مرتب کر سکتے ہیں اور قانون کی حکمرانی کو یقینی بنا سکتے ہیں تاہم منظرنامے میں سویلین بحران کی صورت میں فوجی مصالحت بھی موجود ہے جس کے نتیجے میں پریشان کرنے والا وہی مانوس سول ملٹری تعلق قائم رہے گا جو کہ ایک باقاعدہ منتخب حکومت کے اندر ہوگا۔اس میں فرقہ وارانہ اور نسلی تشدد کا تسلسل بھی شامل ہے تاہم یہ تنہا پاکستان کو کسی بحران کے کنارے پر نہیں لے جائیں گے۔

ان معیارات کے اندر رہتے ہوئے معشیت بہتر اور جمہوریت مستحکم ہوسکتی ہے اور اس میں حکومتی ربط وضبط میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔تاہم یہ سب یا ان میں سے کچھ عوامل ایک دم بدترین شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔اس کے پس منظر میں آبادیاتی صورت حال میں ایک مستقل نوعیت کی گراوٹ ہوگی، تعلیمی نظام کو جدید بنانے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوگی اور نسلی، فرقہ وارانہ اور سماجی تشدد جاری رہے گا۔یہ ایسے رجحانات ہوں گے جن میں ردوبدل بہت مشکل اور فوری تبدیلی تو ناممکن ہوگی۔فوج کی موجودہ مہم کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ خیبر پختون خواہ میں انتہا پسندی اور تشدد پر قابو پالیا جائے گا تاہم لگتا ہے کہ معاشی گروتھ نہ ہونے اور سیاسی اداروں کی کمزوری کی وجہ سے عسکریت پسندی کسی اور مقام پر شروع ہوجائے گی۔پولیس اصلاحات نہ ہونے اور مقامی جہادیوں کے لیے نئے رویے کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ پنجاب میں امن وامان کی صورت حال کی بہتری کا امکان مشکوک ہی رہے گا اور خیبر پختون خواہ میں تو یقیناً اور بھی خراب ہوگا۔بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک دوبارہ دیکھی جائے گی جس میں شاید بیرونی ہاتھ ہوگا۔

جنرل طلعت مسعود کے خیالات کے مطابق ''معاملات میں مداخلت'' کا سلسلہ چلتا رہے گا جو کہ پاکستان کی بطور ریاست یکجہتی کے بتدریج زوال کی شکل میں ظاہر ہوگا اور بطور قوم اس کے تشخص کو اور بھی الجھا دے گا۔موجودہ انتظام کو بچانے کے سلسلے میں جو ایک اہم عنصر ہے وہ یہ ہے کہ لگ بھگ ہر بڑی طاقت چاہتی ہے کہ پاکستان مستحکم اور اپنی مکمل صورت میں برقرار رہے۔حتیٰ کہ بھارت کے انتہائی موقر سٹرٹیجک ماہرین بھی پاکستان کا خاتمہ نہیں چاہتے۔وہ شاید ایک کمزور پاکستان چاہتے ہیں جو صرف اتنا طاقت ور ہو کہ صرف اپنے اندرونی معاملات کو سنبھال سکے، اتنا نہیں کہ بھارت کے لیے کوئی چیلنج بن سکے۔تاہم گذشتہ ایک عشرے کے دوران تیزی سے بڑھتے ہوئے زوال کے بعد کچھ بھارتی سٹرٹیجک

ماہرین یہ سوچنا شروع ہوگئے ہیں کہ آیا اس عمل کو تیز کرنا ان کے مفاد میں ہے یا نہیں۔

علاقائی علیحدگی پسندی، فرقہ واریت اور بھارت کے ساتھ شدید بحران اور افغانستان کے ساتھ کسی خراب معاہدے کے ساتھ پاکستان کو اپنے موجودہ راستے سے بہت دور دھکیلا جاسکتا ہے جس کے نتیجے میں ملک میں نئی اور بے قابو طاقتیں ابھر سکتی ہیں یا آمریت، جبر یت اور بنیادی اصلاحات کی سمت میں کوئی جوابی تحریک شروع ہوسکتی ہے یا کوئی نیا کرشماتی لیڈر سامنے آسکتا ہے جو کہ پاکستان کے لیے تمام متبادل مستقبلیاتی منظر نامے ہیں تاہم ان میں سے کسی کے جلد رونما ہونے کا امکان نہیں۔ان سیاسی پیش رفتوں کے زیر زمین آبادیاتی اور سماجی تبدیلیاں بھی جاری رہیں گی جو کہ ایک زیادہ بڑی بے چینی اور انارکی کی سمت میں جائیں گی۔اس منظرنامے کی صورت میں پاکستان کا مستقبل اس سمت میں گامزن ہوگا جس کی 2008ء کی سٹڈی میں پیش گوئی کی گئی تھی۔

متوازی پاکستان کیا ہوسکتے ہیں؟

اگلے پانچ سال کے لیے پاکستان کا دوسرا مستقبلیاتی منظر نامہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک ایسے ملک کا ہوسکتا ہے جس میں معاملات میں مداخلت چلتی رہے گی اور کئی صوبوں میں اس کی شہادت مل چکی ہے جو کہ متوازی پاکستانوں کا ظہور ہوں گے۔ریاست بظاہر ایک مرکزی حکومت کے ماتحت کام کرتی رہے گی تاہم کچھ صوبے اور علاقے مختلف سمتوں میں جائیں گے یعنی الگ تو نہیں ہوں گے لیکن ان میں حکومتوں کا انداز مختلف ہوجائے گا، ان کی معیشت اور طرح سے ہوگی، تعلیمی نظام مختلف ہوگا اور وہ جمہوریت کے مقابلے میں آمرانہ انداز کی طرف بڑھیں گے اور اسلام پسندوں اور علاقائی اور علیحدگی پسند تحریکوں کو اکاموڈیٹ کریں گے۔

مرکز گریز قوتیں مضبوط ہورہی ہیں اور پاکستان اسی سمت میں بڑھ رہا ہے۔جو لوگ جمہوریت کی مخالفت کرتے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہیں خوف ہے کہ اس سے ریاست کے کمزور ہونے اور علیحدگی پسندی کے بے قابو پھیلاؤ کا خطرہ ہوگا۔جو لوگ جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں وہ اسے ایک ایسے میکانیکی نظام کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں مختلف اور متنوع علاقے اور سماجی طبقات ایک ہی ریاست میں امن وسکون کے ساتھ مل

جل کر رہ سکتے ہیں۔

پاکستانی ریاست کمزور ہوتی ہے اور تقسیم پسند رجحانات میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ حلقے جو ایک طاقتور ریاست چاہتے ہیں وہ یہ دلیل پیش کریں گے کہ پاکستان کو کسی قسم کا بیرونی خطرہ ہے جس کے لیے ضرورت ہے کہ نسلی، فرقہ وارانہ اور دیگر اختلافات کو دبایا جائے۔اس قسم کی سٹریٹجی سے نہ تو پاکستان کے گروتھ ریٹ میں اضافہ ہوگا اور نہ ہی آبادیاتی دھماکے کا کوئی حل ملے گا۔

مستقبل قریب یعنی اگلے پانچ یا چھ سال کے دوران پاکستان یا تو جدوجہد میں مشغول ہوگا یا تیزی سے زوال کی طرف گامزن ہوگا جس کی شہادت اس بات سے ملے گی کہ صوبوں کے درمیان زیادہ پیچیدہ اور ٹوٹ پھوٹ پر مبنی تعلقات ہوں گے یا صوبوں کے مرکز کے ساتھ تعلقات خراب ہوں گے۔اس عمل کو اس صورت میں ٹالا جاسکتا ہے جب سیاست دانوں اور فوجی افسروں کے درمیان خوشگوار باہمی تعلقات کار کا عمل جاری رہے چاہے اس دوران چہرے تبدیل ہوتے رہیں۔جنرل کیانی ناگزیر نہیں ہیں لیکن سیاست دانوں اور جرنیلوں کے درمیان تعلقات کار کی روح ناگزیر ہے۔اسی طرح صدر زرداری اور وزیر اعظم گیلانی بھی ضروری نہیں ہیں لیکن حکومت میں اصلاحات کی کوشش کرتے ہوئے فوج کو کچھ سیاسی جگہ دینے پر آمادگی کی ضروری ہے۔

اس منظر نامے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علاقہ جو بین الاقوامی طور پر پاکستان کہلاتا ہے اسکے اندر کئی پاکستان ابھر سکتے ہیں۔فوج کی گرفت کمزور ہوجائے گی لیکن ناکارہ نہیں ہوگی۔معیشت کی حالت اور خراب ہوگی۔آبادیاتی صورت حال اور فرقہ واریت کے مسائل مزید گہرے ہوں گے۔یہ پاکستان کے بالکل ''لبنان'' بننے کے عمل جیسا نہیں ہوگا تاہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ یہاں حماس اور حزب اللہ کی برابری کے گروپ ابھر چکے ہیں اگرچہ ان کے بیرونی حامی کم دکھائی دیتے ہیں اور ان کا اثر بھی اتنا گہرا نہیں جتنا کے لبنان کے معاملے میں ہے۔فوج اس بات کو یقینی بنائے گی کہ ریاست بدستور قائم رہے تاہم یہ علاقائی اور بیرونی قوتوں کے درمیان گٹھ جوڑ کو روکنے میں ناکام رہے گی۔پاکستان کے شمالی علاقوں میں چین کا قابل ذکر اثر پہلے ہی موجود ہیں اور دیگر جگہوں پر بھی اس کا معاشی فیکٹر بڑھ رہا ہے۔کچھ اقلیتی فرقے اپنے تحفظ اور تحریک کے لیے ایران کی جانب دیکھتے ہیں اور تہران کا

فائدہ بھی اس بات میں ہے کہ وہ پاکستان میں انتہاپسند سنی گروپوں اور افغانستان میں طالبان کے حوالے سے صورت حال کو متوازن کرے۔کراچی میں کچھ رہنما اور خاص طور پر مہاجر برادری اب ایک مختلف تناظر کے ساتھ بھارت کی جانب دیکھ رہی ہے جو ان کے آباؤ اجداد کے تناظر سے مختلف ہے جو کہ بھارت کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔مہاجر ایک آزاد کراچی کی بات کرتے ہیں جس کے دیگر ممالک کے ساتھ مضبوط معاشی اور سیکورٹی تعلقات ہوں جیسا کہ سنگاپور کی شہری ریاست ہے۔آخر میں سندھی اور بلوچ ہیں جو کہ پاکستان سے پہلے ہی سخت ناراض ہیں اور فوج کے ساتھ تعلقات رکھنے والے کسی سخت گیر پنجابی لیڈر کے ابھرنے کی صورت میں وہ مزید الگ تھلگ ہوجائیں گے۔

یہ دو پہلے منظر نامے پاکستان کا زیادہ ممکنہ مستقبل ہوسکتے ہیں۔یہ بالترتیب بد اور بدتر ہیں۔تاہم مستقبل قریب کے پانچ چھ سال کے مختصر عرصے میں مزید مستقبلیاتی منظر نامے بھی ابھر سکتے ہیں۔اس کے بعد کچھ کم تر امکانات لیکن ایسے اچھے راستے بھی ہوسکتے ہیں جو کہ پاکستان اختیار کرسکتا ہے۔

جمہوری امکانات

یہ اگرچہ ابھی بہت غیر ممکنہ لگتے ہیں لیکن پاکستان میں بتدریج اور استقلال کے ساتھ جمہوریت کا استحکام بھی عمل میں آسکتا ہے۔اس کے لیے دو غالب جماعتوں میں اتفاق رائے اور ان کے درمیان ربط و ضبط ضروری ہے اور فوج کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ ریاست کو موثر طریقے سے نہیں چلاسکتی اور اسے سیاست دانوں کی ایک نئی نسل کو اس بات کی اجازت دینی ہوگی بلکہ ان کی معاونت کرنی ہوگی کہ وہ حقیقی طور پر اقتدار میں آئیں۔2010ء میں میں نے سینئر پاکستانی فوجی افسروں کو کہا تھا کہ یہ پاکستان کے لیے بھارت کے مقابلے میں زیادہ بڑا چیلنج ہے لیکن انہوں نے اسکا جواب خاموشی کی صورت میں دیا۔اس قسم کے مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں جمہوریت لانے کے لیے اسے مغربی ممالک کی مسلسل معاونت حاصل رہے اور ساتھ ہی بھارت بھی پاکستان کو اس سمت میں بڑھنے کے لیے مدد دے نہ کہ سعودی عرب اور چین جیسے ملک اس کے لیے مثال بنیں جو کہ استحکام کے نام پر آمرانہ طرز حکومت کی بات کرتے ہیں۔

زرداری حکومت نے اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود پاکستان کو اس راہ پر ڈال دیا ہے اور دیگر مرکزی دھارے کی جماعتوں نے اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی نہیں کیں۔ یہ عمل دکھائی دیتا ہے کہ اب ایک ایسے کھیل میں بدل چکا ہے جس میں ایک قدم آگے بڑھایا جاتا ہے تو ایک قدم پیچھے ہٹایا جاتا ہے یا کسی اور طرف رکھا جاتا ہے۔فائدے اور نقصان کا حالیہ چالاک سکور کارڈ اب زیرو تک آ چکا ہے۔فوج سے مدد مانگنے، جیسا کہ پہلے بار بار مانگی جاتی تھی، کے خلاف پارٹیوں میں مزاحمت بڑھ رہی ہے۔ یہ لگتا ہے کہ انہوں نے یہ سیکھ لیا ہے کہ کھیل کو اس کے قواعد وضوابط کے مطابق کھیلا جائے اور سسٹم کو غیر مستحکم کرنے کے خطرے میں ڈالنے اور مزید دس سال کے لیے اقتدار فوج کی جھولی میں ڈالنے کے بجائے ایک دوسرے کے لیے رواداری اور برداشت کا مظاہرہ کیا جائے۔تاہم ادارہ جاتی جمہوریت لانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ فوج اس بات کا عزم کرے کہ وہ جمہوری فریم ورک میں رہتے ہوئے اپنے ماتحت کردار کے ساتھ مخلص رہے گی۔

پاکستان کے اس سمت میں بڑھنے کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہوگا کہ پاکستان کی معیشت بحال ہوجائے گی اور یقینی طور پر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوگا کہ اس سے وہ دباؤ کم ہوجائے گا جس کی وجہ آبادی میں اضافہ اور غیر شہری زندگی ہے۔ یہ ایسے ٹائم بم ہیں جو پاکستانی ریاست کے نیچے کہیں گہرائی میں دبے ہوئے ہیں اور جو مستقبل کی جمہوری حکومتوں کے لیے بدستور ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں۔لیکن کوئی ایسی حکومت جو موجودہ حکومت کے مقابلے میں کرپشن کے داغ سے محفوظ ہو اور ریاست کے افعال کو بہتر بنانے کے لیے سنجیدگی سے کوشاں ہو عالمی اور بھارت کی جانب سے مدد کے لیے بہت اچھی چیز ہوگی۔

علیحدگی پسندی

اگلے پانچ سال کے لیے اس قسم کی باتیں کرنا کہ پاکستان ٹوٹ جائے گا اور ریاست کے ناراض صوبے اس سے الگ ہوجائیں گے یا ریاست ناکام ہوجائے گی،ایک گمراہ کن بات ہوگی۔ جولوگ اس قسم کے جلد مستقبل کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یقینی طور پر پاکستانیوں کے عزم اور ان کی صلاحیت سے ناواقف ہیں۔رالف پیٹرز نامی ایک ریٹائرڈ امریکی فوجی افسر نے اس قسم کے امکانات کا اظہار کیا تھا کہ پاکستان محض پنجاب اور خیبر پختون خواہ کے کچھ

حصوں تک محدود ہوجائے گا اور سندھ اور بلوچستان اس سے الگ ہوجائیں گے۔اس حوالے سے رالف پیٹرز کے حالیہ دنوں میں پاکستانی فوج کے تعلیمی اور تربیتی اداروں کے دورے کے موقع پر اس کا نام اور پاکستان کی تقسیم میں کسی بیرونی ہاتھ کے ملوث ہونے کے امکانات کا ذکر بار بار ہوتا رہا ہے۔رالف پیٹرز کا کہنا ہے کہ پاکستان کا صوبہ بلوچستان اور ایرانی صوبہ بلوچستان الگ ریاست بن جائیں گے جبکہ خیبرپختون خواہ یا صوبہ سرحد افغانستان کا حصہ بن جائے گا۔

یوں لگتا ہے کہ ریٹائرڈ فوجی افسروں کو یہ آپشن پسند ہے۔مارچ2009ء میں ایک ریٹائرڈ آسٹریلوی افسر ڈیوڈ کلکولین نے پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان چند ماہ کے اندر ہی ناکام ہوجائے گا۔ان پیش گوئیوں کی وجہ یہ ناراضگی ہوسکتی ہے کہ پاکستان افغانستان میں طالبان کی حمایت کررہا ہے یا اس کی وجہ پاکستانی معاشرے اور اس کے ساتھ پاکستانی ریاست سے زیادہ آشنائی نہ ہونا ہوسکتی ہے۔اگرطویل مدتی سطح پر دیکھا جائے تو پاکستان کا ٹوٹنا امکانی ہوسکتا ہے جس طرح کے ''دی آئیڈیا آف پاکستان'' میں بات کی گئی ہے۔تاہم پاکستان کے ٹوٹنے سے پہلے اس بات کا امکان ہے کہ پاکستانی فوج ٹوٹ جائے چاہے یہ کسی جنگ کے بعد ہو یا اسکی وجہ نسلی اورفرقہ وارانہ لڑائی ہو یا فوج کی تقسیم کی وجہ پنجابی سیاسی تحریک ہو۔ہوسکتا ہے کہ کسی کو یہ بات ابھی ممکن نہیں دکھائی دیتی ہو یا وہ اسے پسند نہ کرتے ہوں تاہم سوویت یونین کے ٹوٹنے سے پہلے سوویت ماہرین کو بھی اس کی امید نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے اس کی پیش گوئی کی تھی۔

سول یا فوجی آمریت

پاکستان کے ٹوٹنے سے کہیں زیادہ معقول صورت یہ ہوگی کہ ملک میں کسی نہ کسی شکل میں آمرانہ حکومت قائم ہوجائے گی۔اگر فوج اجازت دے تو ایسا تو صوبائی سطح پر ہوسکتا ہے یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ فوج ایسی کسی صوبائی آمرانہ تحریک میں شامل ہوجائے۔آمرانہ حکومت ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں اختیار کو قائم کرلے تاہم ریاستی قابلیت اور قومی تشخص کے حوالے سے ایک آمرانہ حکومت کو بھی انہی مسائل کا سامنا ہوگا جو کہ کسی بھی قسم کی حکومت کو ہوسکتا ہے۔آمرانہ حکومت کی چار قسمیں ہیں اور پاکستان ان میں سے کسی قسم یا ان قسموں کے کسی

مجموعے کی شکل کو اختیار کرسکتا ہے۔

اول، ایک لبرل آمرانہ حکومت ہے جس کی بہترین مثال سنگاپور میں قائم ہے۔اس میں ایک غالب جماعت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ریاست اچھے طریقے سے چل رہی ہے۔ ناراضگیوں اور اختلافات کی احتیاط کے ساتھ نکاسی کردی جاتی ہے اور معیشت پھلتی پھولتی ہے۔بہت سے پاکستانی فوری طور پر ایک لبرل آمرانہ حکومت کا انتخاب کریں گے بالخصوص سنگاپور کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاں مزید لبرل اصلاحات کے ذریعے معاشی خوشحالی اور سماجی سکون کو قائم رکھا گیا ہے۔تاہم پاکستان میں کوئی سیاسی جماعت اس قابل نہیں ہے کہ وہ اس قسم کی ریاست کو چلاسکے اور فوج بھی اس کے بارے میں سوچنے کی پوزیشن میں نہیں کیونکہ وہ دفاعی امور میں الجھی ہوئی ہے اوراس کی فوج میں اس طرح کا سیکولر اور لبرل رجحان بھی موجود نہیں جس طرح کہ ترک فوج میں ہے۔

صدام حسین کے عراق کی طرز پرکلاسیکی آمرانہ حکومت کا امکان اس سے بھی کم ہے۔پاکستان میں شاید کوئی جابر اور کرشماتی لیڈر ابھرآئے تاہم یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیسے کام کرے گا جبکہ پاکستان میں تیل اور دیگر وسائل کی کمی ہے جو کہ اس طرح کے سخت آمرانہ نظام کو چلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

اعتدال پسند فوجی آمرانہ نظام جو کہ مصر کی طرح ہوسکتا ہے یہ زیادہ معقول ہوگا۔اس قسم کے نظام کی کوشش ایوب خان کی طرف سے ہوچکی ہے حتیٰ کہ مشرف بھی اگر سب کو خوش کرنے کی راہ پر نہ چل پڑتے تو وہ اس سمت میں جاسکتے تھے۔ان میں ناصر اور حسنی مبارک جیسی بے رحمی نہ تھی۔اس قسم کی حکومت کو چین اور سعودی عرب جیسے ملکوں کی حمایت حاصل ہوجائے گی۔اس قسم کا نرم آمرانہ نظام کامیاب بنانے کے لیے بیرونی امداد کی ضرورت ہوگی جس میں معیشت ایک اہم ترین عنصر ہوگا۔یہاں بھی چین ایک بڑا فیکٹر ہوسکتا ہے جو کہ پاکستان کو ایک قابل قبول اسلامی لیکن آمرانہ ریاستی شناخت کا حامل ملک بنانے میں مدد دے سکتا ہے جو کہ اتنا ہی اسلامی ہوگا کہ اسلامی تاریخی بنیادوں پر اپنا جواز فراہم کرسکے تاہم اتنا بھی اسلامی نہ ہو کہ بیرون ملک بالخصوص چین میں چلنے والی اسلامی تحریکوں کی حمایت کرسکے۔اس قسم کا اسلام صرف بھارت یا دوسرے دشمن ممالک کو برآمد کرنے تک محدود ہوگا۔

آخر میں اسلامی آمریت کے دو اور ماڈل ہیں جن میں ایک ایران او ردوسرا سعودی عرب ہے۔ ایرانی ماڈل پاکستان میں نہیں چل سکتا جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں موجود بڑی شیعہ آبادی سنی ریاست کی تھوپے جانے کو برداشت نہیں کرے گی۔ایران کی آبادی خاصی جدید ہے اور لبرل اقدار کے حوالے سے خاصی ہمدردیاں رکھتی ہے اگرچہ وہاں پر اقتدار ملاؤں اور انقلابی محافظوں کے پاس ہوتا ہے جو کہ ایسے ادارے ہیں جو پاکستان میں موجودنہیں۔دوسری جانب سعودی عرب کا ماڈل بھی پاکستان میں کارگرنہیں ہوسکتا کیونکہ ایران اور سعودی عرب دونوں کے مقابلے میں پاکستان کے پاس وسائل بہت کم ہیں اور آبادی بہت زیادہ اور متنوع ہے۔زیادہ امکان صوبائی اسلامی حکومتیں ابھرنے کا ہے جس میں مرکز کو کمزوری کا سامنا ہوگا۔اوپر بیان کیے گئے منظر نامے کے تحت کچھ صوبے خاص طور پر اسلامی بن سکتے ہیں جن کو ایران کی طرح آزادانتخابات کے ذریعے ہٹایانہیں جاسکے گا۔ اسلامی رجحان رکھنے والی ایک صوبائی حکومت (سعودی عرب کی طرح) بنیاد پرستی کو بیرون ملک برآمد کرنے کی کوشش کرسکتی ہے اور اسلام آباد کی حکومت غیر معقول طور پر یہ دعویٰ کرسکتی ہے کہ مرکزی ریاست اس قدر کمزور ہے کہ وہ اس قسم کی سرگرمیوں کو روکنے سے قاصر ہے۔

موجودہ حالات میں اکثر پاکستانیوں کے لیے آمرانہ نظام حکومت قابل قبول نہیں ہوگا لیکن اگر اس کے ذریعے امن و امان قائم ہوجاتا ہے اور کسی حد تک خوشحالی آجاتی ہے تو یہ قدم جمانے میں کامیاب ہوجائے گا اور افغانستان میں طالبان نے یہی کیا تھا لیکن پاکستان میں ایسا ہونے کے لیے پہلی شرط فوج کا منہدم ہونا ہوگی جس کا موجودہ تمام تر حالات میں کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔پاکستان میں مذہبی تنوع اور سماجی حالات اور جنوبی ایشیا کا مخصوص کلچر ہونے کے باعث بھی آمرانہ نظام فٹ نہیں بیٹھتا۔آمرانہ نظام ایک تجربہ ہوسکتا ہے لیکن یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا جس کا زیادہ امکان ناکامی ہوگا کیونکہ یہ معاشرے کے مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہوگا جو کہ مرکزیت پر مشتمل منصوبوں کی وجہ سے بہت بگڑ چکا ہے۔پاکستان میں کسی شخصی حکومت کے ابھرنے کی صورت میں ایسے ہی مسائل کا سامنا ہوگا۔دیگرعوامل میں نیا میڈیا بھی شامل ہے جو کسی بھی شکل کی حکومت کے لیے قدم جمانا مشکل بنادے گا۔

فوج کی قیادت میں انقلاب

فوج کی قیادت میں بھی کسی انقلاب کے اندیشہ ہائے دور دراز ہوسکتے ہیں جو کہ ایک ایسا انقلاب ہوسکتا ہے جس میں فوجی افسران اسی طرح سچے انقلابی بن سکتے ہیں جس طرح بیسویں صدی میں ترک فوج بنی تھی یا زیادہ پیچھے نہ جائیں تو انڈونیشیا کی مثال موجود ہے۔ یہ غیرامکانی بھی ہے اور شاید زیادہ امکانی بھی ہے کہ سویلین اشرافیہ ایک جدت پسندی کی طاقت میں تبدیل ہوجائے۔ انڈونیشیا اگرچہ تقابل کے لیے ایک اچھی مثال ہے لیکن یہ انڈونیشیا سے اس لیے مختلف ہے کیونکہ اس کو (انڈونیشیا) کسی بیرونی دشمن کا سامنا نہیں ہے اور اس کی فوج اور سیاسی طبقہ اپنی تمام تر توانائیاں ملک کی اندرونی سلامتی اور اصلاحات پر صرف کرسکتا ہے۔ اور یوں نتائج شاندار ہوتے ہیں۔

پاکستان فوج کی توجہ کسی اور جانب ہوتی ہے۔ اس کی قیادت جانتی ہے کہ پاکستان دیگر ملکوں بالخصوص بھارت سے پیچھے رہ گیا ہے تاہم اس حوالے سے کیا کیا جائے، اس کے بارے میں کوئی اتفاق رائے موجود نہیں ہے۔ یہ پاکستان کی فوج کی حیثیت سے ایک ایسی پوزیشن میں ہے جس میں یہ ریاست سے بھی بہتر حالت میں ہے جو کہ اسے پالتی ہے اور سٹریٹیجک چیلنج یہ ہے کہ اپنی پیشہ وارانہ مہارت کو کھوئے بغیر اس ریاست کو بہتر بنا یا جائے۔ تاحال یہ ایسا کرنے میں ناکام ہے کیونکہ یہ مقامی اور غیرملکی سکیورٹی کے بحران میں پھنسی ہوئی ہے۔ فوج گولیاں چلانے اور سوچنے کا کام بیک وقت نہیں کرسکتی۔ پاکستان میں سخت قدامت پرستانہ اسلامی اصلاحات کو لانا بھی غیرامکانی ہے۔ چند مستثنیات کے علاوہ ریاست اپنے اندر اصلاحات لانے کی خود بھی صلاحیت نہیں رکھتی۔

بعد از بحران کا منظر نامہ

آخر میں یہ کہ جس طرح 200ء کی سٹڈی میں بتایا گیا تھا کہ یہ بات بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان فوری طور پر بھی تبدیل ہوسکتا ہے بشرطیکہ اسے ایک اور بحران، بالخصوص بھارت کے ساتھ، کا سامنا ہو اور اس میں اب پاکستان کا افغانستان میں کردار اور دہشت گردوں کی کاروائیاں بھی شامل ہوسکتی ہیں جن کا تعلق خود ریاست سے ہے۔

فوج کی شکست تواتر کے ساتھ اس کی اندرونی سیاسی طاقت کو کم کرتی رہی ہے جیسا کہ

1974ء میں قبرص پر ترکی کے حملے کے نتیجے میں یونان میں ہوا تھا یا جیسا1982ء میں فاک لینڈ کی جنگ کے بعد ارجنٹائن میں ہوا تھا۔تاہم پاکستان میں1971ء کی جنگ ہارنے کے بعد بھی پاکستانی فوج اپنے سیاسی اور سویلین کردار سے باز نہ آئی۔اس کے بجائے بھارت سے بدلہ لینے کی سوچ نے جنم لیا اور فوج کو ایٹمی پروگرام کی حمایت کے لیے آگے بڑھایا۔ بھارت کے زیرانتظام کشمیراور بھارت میں مسلم گروہوں کے ساتھ شدت کے ساتھ ملوث ہونے کے نتیجے میں پاکستان کی شہرت ایک غیر ذمہ دار ریاست کی ہوگئی۔شکست کے نتیجے میں ضیاء الحق کے دور میں جنگو ازم پر مبنی قوم پرستی نے جنم لیا جس کی ریاست اور ایسے عناصر نے بھرپور سرپرستی کی جن کے آج بھی ہائپر نیشنل ازم کا پرچار کرنے والے''عزت بریگیڈ'' سے قریبی تعلقات ہیں۔

فوج کے لیے خود کو سیاست سے باہر نکالنے پر غور کرنے کے لیے، جو کہ ایک بڑی تبدیلی ہوگی،کم ازکم ایک فتح اور یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ سلامتی کا ماحول مستحکم اور نارمل رہے گا۔

تبدیلی کے دیگر منظر نامے

پاکستان ایک انوکھا ملک ہے لیکن اس کے بنیادی سیاسی ڈھانچے، فوج کے کردار اور انقلابی تبدیلیوں کی مخفی صلاحیت کا تاریخ کے کئی واقعات سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔

کسی حد تک یہ زار دور کے روس سے ملتا ہے جس کے پاس بہت خستہ حال فوج تھی اور یہ پہلی جنگ عظیم میں ملوث ہونے کے دہانے تک پہنچ چکا تھا۔پاکستان اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کی فوج مربوط ہے جبکہ زار کی فوج تباہ ہوچکی تھی اور اس کا ملک کی عدالتوں اور اشرافیہ پر کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ بالشوک اور دیگر قوتیں اس خلاء کو پر کرنے کے لیے موجود تھیں جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جرمنی کے ساتھ امن قائم رکھنے کے قابل تھیں لیکن پاکستانی اسلام پرستوں کے پاس ایسا کوئی موقع نہیں جب تک کہ فوج اپنے آپ کو قائم رکھتی ہے جبکہ پاکستانی اسلام پسندوں کو مسئلہ یہ ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ تنازعہ کو ختم کرنے کے بجائے بڑھائیں گے۔

جنگ میں مصروف جاپان کے ساتھ بھی جزوی حد تک پاکستان کی صورت حال ملتی ہے

جہاں سول فوجی تعلقات پاکستان جیسے تھے۔ایک جارحانہ فوج جسے جارحانہ بحریہ کا ساتھ بھی حاصل تھا، کے ساتھ جاپان جنگ میں کود پڑا تھا اوراس کے نتائج المناک اور فوج کی تباہی پر مبنی تھے۔ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں اور یہ کسی جوابی ردعمل کے بغیر مشتعل ہوسکتا ہے تاہم اس کی معاشی حالت سامراجی جاپان کے مقابلے میں کمزور ہے جو شاید ہوسکتا ہے کہ جنگ کے بغیر ہی انہدام کا شکار ہوجائے۔

ایران اور ترکی بھی کسی وقت متعلقہ دکھائی دیتے ہیں۔شاہ کے دور میں ایران کسی حد تک اسی سماجی ڈس لوکیشن کا شکار تھا جو ہم آج پاکستان میں دیکھ رہے ہیں تاہم اس کی فوج سیاسی طور پر کمزور تھی اوراسکی شیعہ اسلامی تحریک جسے منظّم ملاؤں کی قیادت حاصل تھی، زیادہ مربوط تھی جس کا پاکستان میں امکان نہیں۔

ترکی کسی زمانے میں پاکستان کے لیے ماڈل رہا ہے جس نے پاکستان کو خوفناک منظر نامے سے بچایا ہے۔ولی ناصر لکھتے ہیں کہ ترکی سرمایہ داری اور جمہوری پیش رفت کے لیے مثال کی حیثیت رکھتا ہے جس نے زیادہ تر یورپی یونین کی مدد سے کامیابی حاصل کی۔ترک جمہوریت کی بنیاد ٹھوس معاشی بنیادوں پر رکھی گئی ہے اوراس نے اسلامی انقلاب پر مبنی سوچ کو ترک کردیا ہے جس میں اسرائیل اور امریکہ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔اس میں سے کچھ اب بھی پاکستان کے سرکاری ورلڈ ویو کا حصہ ہیں۔ جنرل مشرف نے بھی مختصراً ترک ماڈل کا ذکر کیا تھا تاہم پھر وہ اپنے بیان سے پیچھے ہٹ گئے۔ تاہم پاکستان امریکہ تو دور کی بات یورپ کے ساتھ بھی قریبی طور پر ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ اس کا فطری معاشی پارٹنر بھارت ہے جبکہ اس کے بجائے چین پاکستان سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔پاکستان کی فوج اس وقت جو حالات ہیں ان میں خود کو بھارت کی ہم سری کے برابر نہیں لاسکتی ہے جو سماجی اورنسلی اصطلاح میں اس کی قریب ترین ریاست ہے۔

آخر میں برازیل کا ماڈل ہے۔ اس کی آبادی اور معاشی پیش رفت لگ بھگ پاکستان کے برابر ہے اور دونوں زیادہ تر زرعی نوعیت کے ملک ہیں۔ برازیل کے پاس بھی ایک بڑی فوج ہے اور یہ بھی کسی زمانے میں ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کی راہ پر چل رہا تھا۔تاہم اسے پاکستان کی طرح کسی بیرونی خطرے کا سامنا نہیں۔اگرچہ یہ خود کو ارجنٹائن کے حریف کے طور پر پیش کرتا تھا تاہم یہ اس قابل تھا کہ اپنی مقامی سیاست کو اس طرح ڈھال سکے جہاں

MashalBooks.org

نارمل سطح کے سول فوجی تعلقات ابھر سکیں۔اس کے علاوہ یہ اس قابل بھی تھا کہ مقامی اور بین الاقوامی طور پر پیدا ہونے کے ٹیکنالوجی کے گیپ کو پورا کر سکے بالخصوص اس کی جانب سے درمیانے درجے کے طیاروں کی پیداوار میں کامیابی اور کھیلوں کی بین الاقوامی طاقت کے طور پر اس کا کردار وغیرہ۔دس سال پہلے تک آئی ایم ایف سے قرضہ حاصل کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا اور آج یہ آئی ایم ایف کو پیسہ دینے والا ملک بن چکا ہے۔

حاصل بحث

جب ایک ریاست اپنے شہریوں کا تحفظ کرنے اور بنیادی خدمات کی فراہمی کے لئے مطلوب محصولات اکٹھے کرنے میں ناکام ہوجاتی ہے تو اس کے شہری خود کو شہری سمجھنے کے بجائے غلام سمجھنے لگتے ہیں۔وہ ریاست کو چھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بنیادی تصور کو ہی تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس نے ان کو جوڑ رکھا ہوتا ہے یا وہ ریاست سے جنگ کرتے ہیں یا پھر بیک وقت تینوں کام کرتے ہیں۔پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کے پاس کبھی بھی ریاست اور اس کے عوام کے درمیان ایک قابل عمل انتظام موجود نہیں رہا۔پروفیسر حامد قزلباش جو کہ ملک میں جاری فرقہ واریت اور سیاسی تشدد کے بارے میں بات کر رہے تھے کے بقول ''جن لوگوں کو نظر انداز کیا گیا، وہ اب ہم سے انتقام لے رہے ہیں۔''

پاکستان کو ایک نارمل درجے کی ریاست میں واپس لانے کے لیے پانچ یا چھ چیزیں کرنا ضروری ہیں۔ان چیزوں میں بھارت سے تعلقات، معیشت کی بحالی، ریاست کی تعمیر نو،سول اور فوجی تعلقات میں از سر نو توازن،جس میں ریاست میں فوج کے کردار کے حوالے سے نئے سرے سے تعین کیا جائے اور اندورنی عسکریت پسندی سے موثر طریقے سے نمٹنا، پولیس فورس کی از سر نو تنظیم نو اور ہمسایہ ملکوں بالخصوص بھارت کے ساتھ پاکستان کے لیے نئے کردار کی تلاش شامل ہیں۔سیاستدانوں کو اپنے جھگڑوں کو اعتدال پر لانا ہوگا اور سر پرستی اور کرپشن کے بجائے ایشوز اور اصلاحات پر توجہ دینا ہوگی۔

اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو ریاستیں اور سلطنتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔اقوام متحدہ کا قیام جب عمل میں آیا تھا اس کے رکن ملکوں کی تعداد 51 تھی اور آج یہ تعداد192 ہے۔پرانی

چینی، برطانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور جرمن سلطنتیں ختم ہوچکی یا سکڑ چکی ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی راج کہ جس کے بطن سے پاکستان نے جنم لیا، وہ بھی ختم ہوگیا اور اس نے برصغیر کے سٹرٹیجک اتحاد کو پارہ پارہ کردیا اور دوحریف ریاستوں کو ایک دوسرے کے مقابل لاکھڑا کیا۔ سوویت یونین کی سلطنت بھی تحلیل ہوگئی۔ کسی بھی ریاست یا سلطنت کے مستقبل کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یوگوسلاویہ باقی رہا نہ چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی اور منچوریا باقی رہے۔

پاکستان کا مستقبل بھی ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ ایک سا رہے۔ پاکستان کے قیام کو ساٹھ سال ہوچکے ہیں اور اس کے قیام کے صرف چوبیس سال بعد بغاوت کے نتیجے میں اس کا آدھا حصہ ملک سے الگ ہوگیا اور اب یہ وہ رواداری پر مبنی ریاست نہیں رہی جیسا کہ جناح نے سوچا تھا۔ وہ علاقہ اور لوگ جو کہ موجودہ پاکستان میں ہیں وہ باقی رہیں گے چاہے ان کی آبادی مختلف تحریکوں، ماحولیاتی تبدیلیوں، سرحدوں کی از سرنو حد بندی یا کسی جنگ سے کتنی ہی متاثر کیوں نہ ہوں۔ پاکستان کا ایٹمی اسلحہ بھی باقی رہے گا چاہے کسی مرکزی حکومت کا اس پر کنٹرول نہ بھی ہو۔

اس پراجیکٹ میں شامل تمام شرکاء اس بات پر متفق ہیں کہ پاکستان کو اس وقت جو سب سے بڑی بے یقینی درپیش ہے وہ نصف درجن یا اس سے زائد ان عوامل، جو کہ پاکستان کے مستقبل پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، کے درمیان باہمی تعلق ہے جن میں سے کئی عوامل کو ہم چار مجموعوں کی شکل میں پہلے بیان کرچکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف چند ہی شرکاء ہی ایسے تھے جو چند سال سے آگے سے زیادہ کوئی پیش گوئی کرنے پر تیار تھے اور سب اپنی پیش گوئیوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے خواہاں تھے۔ حساس عوامل کے باہمی تعلق، ان کا تسلسل اور مختلف حالات کار میں ان کی خصوصیات تمام نامعلوم تھی اور شاید انہیں معلوم کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ جیسا کہ ولیم میلام نے اپنے کا غذات میں لکھا کہ ان میں اکثر عوامل اسباب اور اثرات دونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو متاثر کرسکتے ہیں اور جواب میں دیگر پیش رفتوں سے بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ تمام عوامل درست سمت میں جارہے ہوتے تو اچھے مستقبل کا منظرنامہ خارج از امکان نہیں تھا۔

پاکستانیوں کو شاید جو مشکل ترین کام کرنے ہیں وہ آسان ترین ہیں:

ایک جدید ریاست کا تصور کر کے اس کے تمام لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنا اور مذہبی تنازعات سے نکلنا۔

جدید ریاستوں میں سویلین اور فوجی اشرافیہ کے درمیان تعلقات نارمل ہوتے ہیں اور وہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ریاست کے ادارے اپنے شہریوں کے قانونی ضروریات کو پورے کرتے رہیں۔وہ ساٹھ سال پہلے ختم ہوجانے والی سامراجی ریاستوں کے بدترین پہلوؤں کی نقالی نہیں کرتیں۔تاہم جدت پسندی اس وقت مشکل ہوجاتی ہے جب ایک ریاست گلوبلائزیشن کی طاقت کے گھیرے میں آجاتی ہے جس سے اس کے ادارے کمزور ہوجاتے ہیں اور علیحدگی پسند اور دہشت گرد گروپ مضبوط ہوتے ہیں۔

پاکستان کے پاس وسائل ہیں۔اس کی اپنی ایک اہمیت ہے۔بھارت کے ساتھ اس کے تنازعے میں ایٹمی ہتھیاروں کے شامل ہوجانے سے اس کی بقاء اور نارمل حالت میں واپس آنے کے حوالے سے بین الاقوامی برادری کے اس میں طاقتور سٹیک ہیں۔تاہم پاکستان کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر فوکس کیا جائے جو کہ افزائش میں اضافہ کرتیں اور گورننس میں ملکیت کا زیادہ احساس پیدا کرتی ہیں۔پاکستان کی آبادی جسے اکثر سیاسی رہنماؤں کی جانب سے غیر متعلقہ سمجھا جاتا ہے اس کو عسکریت پسندی سے جنگ اور دیگر اندرونی بغاوتوں کو ختم کرنے کے لیے اثاثہ بنایا جاسکتا ہے۔پاکستان کو ایک قومی بحث کی ضرورت ہے جس کے ذریعے اس بات کی تعین کیا جاسکے کہ اس کے شہری اپنے ملک کو کس قسم کی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔دیگر الفاظ میں پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے اعلیٰ اہداف کا تعین کرے اوران کو دور و نزدیک میں واقع دیگر ریاستوں پر انحصار کی بجائے اپنے ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔پاکستانی سیاست دانوں کی مختصر مدتی سوچ اور فوج کے ادارہ جاتی اوبسیشن کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس قسم کی بحث کیسے شروع کی جاسکتی ہے۔

خطرے کے چھ اشارے

ہم2004ء کی طرح خطرے کے اشاروں سے اختتام کرتے ہیں۔جہاں ہم نے مختلف عوامل کو چار مجموعوں کی صورت میں شناخت کیا ہے وہاں خطرے کے یہ اشارے ایسی چیزیں

جن پر فوری طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تاہم پاکستان میں حالات کو معمول پر لانے کے عمل کو یقینی بنانے کے لیے صرف یہی ایشوز کافی نہیں۔

معاشی معاملات کو ڈیل کرنے میں ہچکچاہٹ

پاکستان اپنے معاشی امکانات کے حوالے سے سالہا سال سے خوابوں خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔ یہ اپنی معاشی ناکامیوں کا الزام دوسروں پر عائد کرتا ہے اور ایسی کامیابیوں کا دعویٰ کرتا ہے جو نہ دکھائی دینے والا بھوت ہیں۔غریب آبادی کو ریاستی سرمایے سے تعلیم دلانا تو درکنار تاحال یہ اپنے امیرلوگوں سے ٹیکس لینے میں بھی ناکام ہے۔مشرف دور کے بعد حقیقت پسندی کا ایک نیا احساس جاگا ہے لیکن دفاع اور سیکورٹی ایشوز پر پاکستان تاحال بہت زیادہ خرچ کررہا ہے۔ پاکستان کو مختصر مدتی طور پر اپنی فوج پر اخراجات کو کم کرنا ہوگا تاکہ طویل مدتی طور پر پاکستان سیاسی انتظامات کے ذریعے اور ہتھیاروں کے پروگرام اور افرادی قوت پر بھاری اخراجات کو کم کرکے افزائش حاصل کرسکے جو کہ دفاع کے مسائل کو کم کریں۔خطرناک آبادیاتی رجحانات، جو کہ مستقبل میں پاکستان کو اس موڑ پر پہنچادیں گے جب نہ تو یہاں کوئی حکومت چل سکے گی اور نہ ہی یہ ملک رہنے کے قابل ہوگا، سے نمٹنے کے لیے معاشی گروتھ ہی واحد راستہ ہے۔

ریاستی اداروں کی تعمیر نو میں عدم آمادگی اور نا قابلیت

ہوسکتا ہے کہ پاکستان اپنے کمزور ریاستی اداروں کے حوالے سے ناقابل واپسی راستے سے آگے جاچکا ہو چاہے یہ تعلیم، مقامی انتظامیہ اور اعلیٰ بیوروکریسی جیسے ادارے ہوں۔تاہم یہ مسائل ناقابل حل نہیں اور پاکستان کو عالمی برادری سے مدد درکار ہے۔نجی ادارے اور این جی اوز متبادل نہیں۔فوج کو اس بات کی اجازت دینا ہوگی کہ وہ سویلینز میں مہارت پیدا ہونے دے تاہم اس کے لیے بھی یہ ضروری ہوگا کہ فوج وقفہ کرنے پر آمادہ ہو اور سویلینز میں خاصی حد تک مہارت پیدا ہوجائے۔علاوہ ازیں تعلیم اور ریاست سازی کو بھی وہی ترجیح دینا ہوگی جو دفاعی پالیسی کو دی جاتی ہے۔

اوپری سطح پر گورننس کی غیر موجودگی

MashalBooks.org

حالیہ تمام بحرانوں، چاہے یہ بیرونی ہوں یا اندرونی، میں حکومت نے اوپر کی سطح پر غیر معمولی بدنظمی کا مظاہرہ کیا۔ممبئی حملوں کے بعد اسلام آباد میں افراتفری کی حکمرانی تھی اور جب ایک سویلین (نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر، جو سابق جنرل تھا) نے ریکارڈ درست کرنے کی کوشش کی تو اسے برطرف کردیا گیا۔حکومت کے سامنے متبادل پالیسیاں پیش کرنے کا کوئی مربوط نظام موجود تھا نہ ہے۔ کوئی بصیرت افروز منصوبہ بندی نہیں اور حکومت کے مختلف حصوں کے افعال کے درمیان کوآرڈی نیشن کا کوئی موثر طریقہ کار بھی دکھائی نہیں دیتا۔عام طور پر فوج کا اپنا راستہ ہے تاہم اس بارے میں کوئی دو رائے موجود نہیں کہ پاکستانی فوج سوائے چھوٹی نوعیت کے فوجی مسائل کے کسی معاملے میں کوئی مربوط سٹرٹیجی تشکیل دینے کے حوالے سے سٹرٹیجک قابلیت نہیں رکھتی۔اس میں اندرونی دہشت گردی، جس نے پورے ملک بالخصوص خیبر پختونخواہ کا گورنمنٹ فری زون کو لپیٹ میں لے رکھا ہے، سے نمٹنے کے لیے رسپانس بھی شامل ہے۔اگر پاکستان ایسا کوئی میکنزم، جیسے ایک نیشنل سیکورٹی کونسل (مشرف کی شرمناک این اسی ایس کے برعکس) تخلیق نہیں کرتا تو وہ سٹرٹیجی کے اعتبار سے نیچے کی طرف گرتا رہے گا۔

بھیک کا کشکول

پاکستان ایک ایسی پوزیشن میں جاچکا ہے جس میں اسکا تمام تر انحصار ڈونر اداروں پر ہے اور جب حکومت پر اس حوالے سے تنقید کی جاتی ہے تو وہ بے جا نہیں ہوتی، چاہے وہ اس سلسلے میں دوسری ریاستوں سے مدد مانگ رہی ہو یا مالیاتی ایجنسیوں کے سامنے دامن پھیلا رہی ہو۔ پاکستان کو ایک ایسا تعلق کار تشکیل دینے کی ضرورت ہے جس میں اس کا وقار اور خود مختاری محفوظ رہے۔اگر آئی ایم ایف سے قرضے لینے کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں قدم پاکستان کی طرف اٹھایا جانا چاہیے، باہر سے نہیں۔ پاکستان کو امدادی پروگرام کے لیے سکوپ اور اہلیت پیدا کرنی چاہیے اور ڈونر کی مدد لینی چاہیے۔شرائط پاکستان کی طرف سے آنی چاہئیں جن میں تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اگر پاکستان شرائط کو پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو امداد طریقہ

MashalBooks.org

کار کے مطابق کم کی جانی چاہیے۔اس کے لیے اس سے زیادہ صلاحیت چاہیے جو کہ پاکستان کے پاس اب ہے لہٰذا اس سلسلے میں حکومت کو ممتاز ماہر حکومتوں سے مدد مانگنی چاہیے کہ وہ اس کے بجٹ اور پلاننگ سائیکل کو بہتر بنائیں اور ساتھ ہی پرائیویٹ سیکٹر سے بھی رجوع کرنا چاہیے جہاں بہت سا ٹیلنٹ موجود ہے۔"ٹف لوّ" (tough love) ایک مناسب معیار ہے اور پاکستانیوں کو خود اس پر اصرار کرنا چاہیے۔

بھارت کے ساتھ نئے بحران

مزید خرابی سے بچنے کے لیے بھارت کے ساتھ مزید نارمل تعلقات پاکستان کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔اگرچہ بھارت ایک ایسا پاکستان نہیں چاہتا جو اس کا مقابلہ کر سکے تاہم ایک ناکام پاکستان بھارت کو قابل ذکر حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے۔پچھلے ساٹھ سالہ تنازعات کے ایٹمی شکل اختیار کرنے سے سٹیک زیادہ اوپر چلے گئے ہیں۔مزید بحران ،چاہے یہ دانستہ ہوں یا نادانستہ، پاکستان کو تعمیری ٹاسک سے ہٹادیں گے اور خود بھارت کو بھی خطرے میں ڈال دیں گے۔دونوں ریاستوں کے درمیان نارملائزیشن کے لیے میکنزم تیار ہیں۔اگر وہ اسی راستے کی طرف جاتے ہیں تو اس عمل کو بیرونی طاقتوں کی طرف سے حوصلہ افزائی،حتیٰ کہ اقوام متحدہ کی جانب سے بھی منظوری حاصل ہوگی۔

اسلام پسندوں کو مزید خوش کرنے کا عمل

پاکستان میں پولرائزیشن بڑھ رہی ہے اور لبرل عناصر دفاعی پوزیشن میں چلے گئے ہیں۔اسلام میں اصلاحات کے حوالے سے عالمی ڈائیلاگ ایک پاکستانی پہلو رکھتا ہے۔تاہم بہت سا میدان اسلام نظریہ سازوں کے سامنے ہارا جا چکا ہے جنہیں ریاست کی قابل ذکر سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔اس نے پاکستان کو پہلے ہی خاصا تبدیل کر دیا ہے اور اصل مسئلہ اسلام پسندوں کی تنگ نظری اور عدم رواداری کی قوت نہیں بلکہ جدید اسلام پسندوں اور چھوٹی سی مغرب نواز اشرافیہ کی کمزوری ہے۔پاکستان عالمی جہاد کا ایک مرکز بنتا جا رہا ہے۔

پالیسی : امید اور مایوسی کے درمیان

افغانستان کی طرح پاکستان کے بارے میں بھی پالیسی پر صرف بے یقینی کے سائے

نہیں۔دونوں صورتوں میں(اور یہ کئی طریقوں سے باہم منسلک ہیں) پالیسی کے حوالے سے اچھے آپشن موجود نہیں۔کچھ نہ کرنا اور ایک ہی چیز کیے جانا ایسے آپشن ہیں جو دونوں بے کشش اور مشکلات پیدا کرنے والے ہیں تاہم مستقبل کے حوالے سے آسان راستہ موجود نہیں اور پالیسی کے حوالے سے کسی سانحے کے قوی امکانات بدستور موجود ہیں۔

پراجیکٹ میں شامل کچھ شرکاء نے پاکستان کے مستقبل، حتیٰ کہ اگلے پانچ سال کے دوران، کے حوالے سے مزید بڑے مصائب کی پیشگوئی کی تھی۔ تاہم ایک واقعہ جس کے بارے میں وہ کوئی پیش گوئی نہیں کرسکے تھے وہ2010ء کا سیلاب تھا جس نے پاکستان کے بڑے حصے کو جولائی2010ء کے بعد کئی ماہ تک ڈبوئے رکھا تھا۔اس کی وجہ نہ صرف منفی موسمیاتی تبدیلیاں تھیں بلکہ پاکستان کے فوجی اور سول حکمرانوں کی چالیس سالہ غفلت بھی تھی جنہوں نے آبی نظام کے حوالے سے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔اس سیلاب کے نتائج کے بارے میں تاحال بحث کی جارہی ہے تاہم اس سے کسی قسم کی قومی یگانگت نے جنم نہیں لیا جس کی کہ امید تھی اور امکان یہی ہے کہ اس کا نتیجہ محض ایک منفی نوعیت کے''کالی بطخ'' کے واقعے کے کچھ نہیں نکلے گا۔

تاہم دوعوامل ایسے ہیں جنہوں نے امید کی جوت جگائی ہے تاہم یاد رہے کہ امید کوئی پالیسی نہیں ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان کے پاس سمت کی تبدیلی کے''ہیومن کیپیٹل'' موجود ہے۔ اس کی مختصر سی اشرافیہ قابل ہے اور اس کی مڈل کلاس تاحال اصلاحات کی خواہش مند ہے۔پاکستان کو جمہوریت کا تجربہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اسے آٹو کریسی کے ذریعے نہیں چلایا جاسکتا چاہے یہ فوجی ہو یا سویلین اور چاہے یہ کتنی ہی کرشماتی کیوں نہ ہو۔

دوسرا یہ کہ پاکستان کی کامیابی، یا کم ازکم یہ اس قدر بری طرح ناکام نہ ہو،عالمی برادری کے مفاد میں ہے۔کوئی ملک حتیٰ کہ بھارت بھی یہ نہیں چاہتا کہ پاکستان متشدد طریقے سے ٹوٹ جائے کیونکہ حقیقی طور پر اس کی ناکامی ایٹمی ہتھیاروں اور دہشت گرد گروپوں کو پوری دنیا میں متحرک کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو توڑنے کا آپشن غیرعملی اور خطرناک ہے۔

مغربی طاقتیں، جاپان اور بھارت کو پاکستان کی جانب سے مربوط پالیسی کی ضرورت

ہے۔ ایسی پالیسی جو اصلاحات کے عمل اور جمہوری قوتوں کو کو مضبوط کرے۔ فوج کی حوصلہ افزائی کرے کہ وہ آرام سے وقفہ کرے۔ پاکستان کی معیشت کو بہتر کرے اور بنیادی ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مزید ذرائع پیدا کرے۔ تاہم چین پاکستان کا ایک ایسا اتحادی ہے جو جمہوریت کا حامی نہیں اور دہشت گردوں اور انتہا پسندوں سے نمٹنے کے لیے سخت اقدامات کی حمایت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں شمالی کوریا کی مثال بہترین ہے اور ایسی ریاستوں کی حمایت کر کے چین علاقائی حریفوں کے حوالے سے توازن پیدا کرتا ہے اور اپنے معاشی اور سٹریٹیجک اہداف حاصل کرتا ہے۔

جہاں تک فی الحال جاپان اور مغرب کا تعلق ہے تو ان کی پاکستان کے لیے پالیسیوں کا دارومدار افغانستان میں نیٹو اور امریکی انتظامات پر ہے۔ ان کی پالیسی کا دوسرا جز یہ ہے کہ طالبان اور دیگر انتہاپسندوں کے خلاف پاکستان کی حمایت کی جائے۔ تیسرے یہ کہ پاکستان کو بے مثال معاشی امداد بالخصوص کیری لوگر بل کی شکل میں دی جا رہی ہے۔ کیری لوگر اقدام کا مقصد یہ سوچ ہے کہ ایک ناکام پاکستان امریکہ کے لیے زیادہ تباہ کن ہوگا۔ پاکستان کی مثال شمالی کوریا کی طرح ہے۔ تاہم بہت کم حلقوں نے پاکستان کے لیے بڑے پیمانے پر قومی تعمیر کے پروگرام کے حوالے سے حمایت کی ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کمزور اور غیر مستحکم ہے تو اس حوالے سے متبادل پالیسیوں کے بارے میں سوچنا بلا جواز نہیں۔ ایک تو یہ ہوسکتا ہے کہ بھارت کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ افغانستان کے حوالے سے پاکستان کی جگہ لے لے اور افغانستان کے لیے متبادل راستہ فراہم کردے تاکہ اسلام آباد کو دکھایا جاسکے کہ اس کی جانب سے راستے منقطع کرنے کی جو دھمکیاں دی جاتی ہیں، اس کا جواب موجود ہے۔ اس پالیسی کی ایک توسیع سفیر رابرٹ بلیک ول کی یہ تجویز ہوگی کہ افغانستان کو تقسیم کردیا جائے جسکے تحت امریکہ شمالی اتحاد اور بھارت کی مدد کرے تاکہ پاکستان کی جانب سے جنوبی افغانستان میں طالبان کی پشت پناہی پر قابو کیا جاسکے۔

پاکستان کے حوالے سے توازن پیدا کرنے کے لیے بھارت کو استعمال کرنے میں مشکل یہ ہے کہ اس سے پاکستانی فوج کو کچھ منفی فائدے حاصل ہوتے ہیں کہ وہ اندرونی اصلاحات کے حوالے سے اقدامات شروع کرے اور اس سے یقینی طور پر پاکستان اور

بھارت کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔ وہ حلقے جو پاکستان میں اصلاحاتی سٹریٹجی کی بات کرتے ہیں وہ متوازن پالیسی کے لیے اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں اور اس کے لیے وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اس سے تو اصلاحات کا امکان سرے سے ختم ہوجائے گا۔

اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ پاکستان محض ایک ایسی ریاست نہیں جو مشکل میں گرفتار ہو بلکہ یہ ایک بدمعاش ریاست بن جائے گی جس کی پھر اصلاح ہو ہی نہ سکے چاہے اس کی بنیاد ماضی کے پاکستانی تجربات پر ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا ایک متوازن پالیسی اختیار کرکے اس کو آسانی کے ساتھ بچاؤ بند میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس چیز کو کونسل آف فارن ریلیشنز ٹاسک فورس نے مسترد کردیا تاہم کم ازکم ایک رکن نے اس اختلاف کو ظاہر کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان کو صرف اس بنیاد پر نہ پرکھا جائے کہ وہ مختلف شعبہ جات میں صرف امریکی مفادات کو پوری کرنے والی پالیسیوں کو اختیار کرے جیسا کہ بھارت کے ساتھ تعلقات، ایٹمی پالیسی اور دہشت گردوں کی حمایت وغیرہ۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کی موجودہ پالیسیاں کام نہیں کررہی ہیں اور یہ کہ امدادی پیکجز کا اتنا اثر نہیں ہورہا اور یہ پاکستان کی قوم پرستی پاکستان کے قومی مفاد کو ٹرمپ کررہی ہے تو پاکستان کو ایک اثاثہ نہیں بلکہ خطرہ سمجھنا چاہیے۔ اس سے یہ تصدیق ہوجائے گی کہ اگر پاکستان کی مدد سے بھارت یا کسی مغربی ملک پر دہشت گردی کا کوئی حملہ ہوتا ہے تو جیسا کہ نیویارک میں ٹائم سکوائر میں ہوا جس میں کئی امریکی شہری مارے گئے۔ اس صورت میں امکان ہوگا کہ رائے عامہ پاکستان کے ساتھ تعلقات کا ازسرنو جائزہ لینے کا مطالبہ کرے گی۔

اس قسم کے ازسرنو جائزے میں بھارت کا کردار یہ ہوگا کہ وہ ایک خطرناک پاکستان کو روکے اور صورت میں ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی پالیسی آجائے جس میں بھارت کو جنوبی ایشیا کی جیوسٹریٹجک کیلکولیشن میں مرکزی حیثیت مل جائے جس میں وہ مغرب بھارت کے ساتھ مل کر ہمیشہ کے لیے افغانستان اور پاکستان کو ٹھیک کردے۔ اس صورت میں امریکہ ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ ہوگا اگرچہ بھارت اس قسم کے علاقائی کردار کے لیے شدید شکوک وشبہات کا شکار ہے۔

مزید پانچ چھ سال بعد کی جانب دیکھا جائے تو اگر پاکستان میں جاری بگاڑ کے باوجود بھارت کی جانب سے کوئی مداخلت نہیں کی جاتی (یعنی ناکام ہوتے پاکستان کو بچانے یا

متوازن کرنے کے لیے بھارت کوئی سرگرم کردار ادا کرنے پر تیار نہیں ہوتا) تو اس صورت میں امریکہ اور اس کے اتحادی شاید کوئی ''آف شور'' طریقے سے یہ توازن قائم کریں۔کالم نگار ٹام فرائیڈ مین کا کہنا ہے کہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا جیسے علاقے آخرکار کسی امریکی مداخلت کے بغیر ہی اپنی مشکلات پر قابو پالیں گے۔ تیزی سے کم ہوتے وسائل اور دخل اندازی پر ناراض ملکی رائے عامہ کے باعث امریکہ اوراس کے اتحادی شاید یہ فیصلہ کرلیں کہ جنوبی ایشیائی ریاستیں اپنے معاملات کو خود ہی اچھے طریقے سے سلجھا سکتی ہیں تو اس صورت میں ہمیں صرف یہ ضرورت ہوگی کہ اگلے پانچ سال تک خطے کو ایٹمی جنگ سے بچالیں۔تاہم بھارت دشمنی کے حوالے سے معاملات میں دیگر کئی ریاستیں بھی ملوث ہیں جن میں چین قابل ذکر ہے جو کہ ایک اہم جنوبی ایشیائی طاقت بن چکا ہے اور جو خود بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان توازن پیدا کرنے کے لیے اپنی گیم کررہا ہے۔پالیسی سازوں کو یہ بات احتیاط کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے کہ آیا امریکی مداخلت سے خطے میں کوئی اثر ہوبھی رہا ہے یانہیں اور یہ کہ جنوبی ایشیا میں امن عمل میں شریک نہ ہونے کی صورت میں کیا نقصان ہوسکتا ہے۔

دو دیگر پالیسیوں کا بھی ذکرکرنے کی ضرورت ہے اگرچہ دونوں میں کچھ سنگین خرابیاں ہیں۔سٹیوکول کا نکتہ نظر ہے کہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان فساد کی جڑ ہے اور اگر بیرونی طاقتیں اس مسئلے کوحل کرانے میں کوئی کردار ادا کرتی ہیں تو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کا خطرہ کم ہوجائے گا اور پاکستان اپنی تمام تر توانائیاں تعمیرنو اور بحالی پر خرچ کرسکے گا۔یقیناً بھارت کی جانب سے اس کی پوری قوت سے مخالفت کی جائے گی تاہم اگراس کے بدلے کشمیر کا مسئلہ حل کرلیا جائے تو یہ بھی ٹھیک رہے گا جس کے بارے میں سٹیوکول کا کہنا ہے کہ یہ ہدف حاصل کیا جاچکا ہے۔ اگر پاکستان بھارت کے ساتھ تعلقات کو نارمل کرلیتا ہےتو تعاون شاید سرحد پارتک وسعت اختیار کرلے اور وہ سٹرٹیجک اتحاد ایک بار پھر بحال ہوجائے جو اس نے1947ء میں تقسیم کے وقت کھودیا تھا۔تاہم بھارت کی جانب سے ناکام پاکستان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں ہچکچاہٹ سے قطع نظر چین کے پاس اس بات کا پورا جواز موجود ہے کہ وہ نارملائزیشن کی مخالفت کرے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بھارت سے تعلقات کو نارمل کرنے سے زیادہ تعلقات نارمل نہ کرنے کے لیے زیادہ پیش کش کرے یعنی بھارت

تعلقات نارمل کرنے میں جتنا فائدہ دیتا ہے چین پاکستان کو اس سے زیادہ فائدہ تعلقات نارمل نہ کرنے کی صورت میں دے۔پچیس سال قبل جب پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام شروع کیا تو اس نے پیش کش کی کہ پاکستان اپنا ایٹمی پروگرام ختم کرسکتا ہے بشرطیکہ کہ بھارتی حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان کوتحفظ کی ضمانت دے۔امریکہ نے پاکستان کی یہ پیش کش مسترد کردی جس کے بعد پاکستان نے اپنا ایٹمی پروگرام آگے بڑھایا اور وہ اب اس کا چین پر پہلے سے بھی زیادہ انحصار ہوچکا ہے۔چین کے نئے اثر ونفوذ اور پاکستان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے میں بھارت کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی ایشیا کی سٹرٹیجک یکجہتی کا امکان اب کم ہوکر صفر تک پہنچ گیا ہے۔

سیاست ایک نظریاتی نہیں تجرباتی سائنس ہے۔ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ تجربہ اگلے دو سال کے دوران کیسے کام کرتا ہے تاہم یہ امید کرنا بہت مشکل ہے کہ مغرب یا امریکہ افغانستان اور پاکستان دونوں کو سیدھا کردیں گے اور یہ کہ بھارت ایک دم حاتم طائی بن جائے گا اور یہ کہ پاکستانی اشرافیہ بالخصوص فوج گہرائی کے ساتھ کسی قسم کی اصلاحات کرے گی۔بہتر کی امید کرنی چاہیے لیکن بدترین کے بارے میں بھی کم ازکم سوچنا تو چاہیے۔

MashalBooks.org

ضمیمہ

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں

نائن الیون سے کچھ عرصہ پہلے تک پاکستانی حکام اور اسٹیبلشمنٹ کا بیانیہ یہ تھا کہ ان کا ملک بیرونی امداد کے ساتھ اپنی معاشی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے، مغرب کے اتحادی کے طور پر اپنا درست مقام حاصل کرسکتا ہے اور اسلامی دنیا کی اعتدال پسند صورت دنیا کے سامنے کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔ پاکستان ایک پُل ہوگا جو دیگر مسلمانوں کے لیے جدت کا گیٹ وے ہوگا۔ مغرب کے لیے اسلام کا گیٹ وے ہوگا۔ جارج بش انتظامیہ کا بھی یہی خیال تھا جس نے اسلام آباد کے ساتھ تعلقات کی تعمیر نو کا کام شروع کیا تھا۔

اس امید افزاء بیانیے کو اب متضاد بیانیوں کی جانب سے چیلنج کیا جارہا ہے جو کہ قیامت جیسا منظر نامہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان پہلے ہی ایک ناکام ریاست بن چکا ہے۔ وہ بنیاد پرست اسلامی کاز کا ایک بدنام حامی اور بین الاقوامی دہشت گردی کا منبع ہے۔ ناکام، خام اور اس قسم کی اصطلاحات کو آج کل پاکستان کے ساتھ سابقوں لاحقوں کی طرح استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کے بارے میں خاص طور پر کہا جارہا ہے کہ یہ ناکام ریاست ہے یا ناکامی طرف بڑھ رہی ہے یا یہ ایک قسم یا دوسری قسم کی عفریت ریاست ہے۔ کئی مغربی

MashalBooks.org

ممالک پاکستان کو ایک ایسی ریاست کے طور پر دیکھتے ہیں جو ناکامی کے قریب پہنچ چکی ہے اور اہم ترین یہ بات کہ اس کو اس کی طاقت نہیں بلکہ کمزوری کی وجہ سے امداد کی ضرورت ہے۔

مشرف حکومت کے خاتمے سے پہلے جو کئی تجزیے مکمل کیے گئے تھے ان میں موجود بحران کی امید ظاہر کی گئی تھی۔ ان میں شاید سب سے سخت خیالات پاکستانی امور کے ماہرین کے ایک اس گروپ کے تھے جنہیں نیشنل انٹیلی جنس کونسل کے2000ء کے اجلاس میں بلایا گیا جو کہ 2015ء تک عالمی پیش رفتوں کے حوالے سے پراجیکشن کا حصہ تھا۔ ان میں پاکستان اور بھارت کے بارے میں دیے جانے والے پیرے خاص طور پر مکمل طور پر دیے جانے کے قابل ہیں کیونکہ یہ پیش گوئیاں نائن الیون سے پہلے اس وقت جمع کی گئی تھیں جب صدر مشرف کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔

علاقائی طور پر ماہرین کی مجموعی رائے یہ تھی کہ 2025ء تک جنوبی ایشیائی سٹریٹیجک تعلقات کا فیصلہ پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑھتے ہوئے فیصلے اور ان کی بظاہر شدید نوعیت کی دشمنی سے ہوگا۔ ماہرین کسی چھوٹی یا بڑی جنگ کے امکانات کے حوالے سے چوکنے تھے۔ ان کا کہنا تھا:

''بھارت ایک بڑی فوج بشمول بحری اور ایٹمی صلاحیت کے ساتھ ایک بڑی طاقت ہوگا جس کی معیشت بہت مضبوط اور طاقتور ہوگی۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج۔۔۔ جو بذات خود استحکام کا دشمن ہے۔۔۔ اور اسکے ساتھ دونوں ریاستوں میں گہری سیاسی، معاشی اور سماجی عدم برابری ہوگی۔ پاکستان زیادہ ٹوٹا پھوٹا، تنہا اور بین الاقوامی مالی امداد کا محتاج ملک ہوگا۔

اگلے پندرہ سال تک پاکستان اور بھارت کے درمیان کسی بھی بڑے تنازعے کا خطرہ دیگر تمام علاقائی ایشوز پر غالب ہوگا۔ افغانستان اور پاکستان میں بڑھتی ہوئی بدامنی کے اثرات کشمیر اور برصغیر کے دیگر خطوں پر بھی پڑیں گے جس کے نتیجے میں بھارتی رہنما زیادہ جارحانہ پیش بندی اور جوابی کاروائی پر مجبور ہوں گے۔ بھارت کو پاکستان پر حاصل روایتی فوجی سبقت سے بھارت کی معاشی برتری میں اضافہ ہوگا۔ بھارت اپنی بحریہ کی قوت کو بڑھاتا رہے گا تاکہ بحر ہند کے ٹرانزٹ روٹس پر غلبہ قائم کرسکے جو ایشیا کو خلیج فارس کا تیل

سپلائی کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ آنے والے سالوں میں روایتی فوج طاقت میں فیصلہ کن شفٹ بھارت کے حق میں ہوگی جس کی وجہ سے خطہ امکانی طور پر زیادہ پر تنازعہ اور غیر مستحکم ہوگا۔ بھارت اور پاکستان دونوں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو ایک سٹرٹیجک ضرورت کے تحت لیں گے اور ایٹمی وار ہیڈز کو جمع کرتے اور مختلف اقسام کے میزائل سسٹم تیار کرتے رہیں گے۔''

اس سے یہ مفروضہ قائم ہوتا ہے کہ بھارت اپنے نئی عالمی حیثیت کو علاقائی برتری میں تبدیل کرنے کے قابل ہوگا اور اسے اچھا سمجھا جائے یا بُرا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک ابھرتا ہوا بھارت اور زوال پذیر پاکستان کے ٹکرانے کا امکان ہوگا۔ خود پاکستان کے بارے میں 2050ء تک کی صورت حال کے بارے میں ماہرین کا کہنا تھا:

''پاکستان عشروں پر پھیلی ہوئی سیاسی اور معاشی بدانتظامی، منقسم سیاست، لاقانونیت، کرپشن اور نسلی تفاوت سے آسانی کے ساتھ نہیں نکل سکے گا۔ سیاسی اشرافیہ اور بنیاد پرست اسلامی جماعتوں کی مخالفت کی وجہ سے جمہوری اصلاحات بہت کم تبدیلی لاسکیں گی۔ مزید جمہوری زوال کے نتیجے میں فائدہ اسلامی سیاسی کارکنوں کو ہوگا جو اس کے نتیجے میں قومی سیاست میں اپنے کردار میں اضافہ کریں گے اور فوج کی ساخت و ماہیت میں ردوبدل کریں گے جو کہ کبھی پاکستان کا قابل ترین ادارہ تھی۔ اندرونی بدامنی کے مسلسل ماحول میں مرکزی حکومت کا کنٹرول پنجاب کے قلب اور کراچی تک محدود ہوجائے گا۔''

اس کے چند سال بعد ان ماہرین کے تحفظات کے باوجود این آئی سی (NIC) نے پاکستان کا معمولی سا ذکر کیا اور وہ بھی عالمی تبدیلی کے تین میں سے ایک منظر نامے کے تناظر میں کیا گیا۔

2004ء میں سنٹر فار سٹرٹیجک اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز (سی ایس آئی ایس) کے ایک پراجیکٹ میں پاکستان کے بارے میں احتیاط کے ساتھ ایک امیدا فزاء نتیجہ نکالا گیا۔ یہ پراجیکٹ مکمل ہوا تو مشرف کے اقتدار کا تیسرا سال چل رہا تھا جس میں پاکستان میں تبدیلی اور اصلاحات کے امکانات کا جائزہ لیا گیا جن کا زیادہ تر تعلق میکرو سیاسی اور معاشی عوامل سے تھا اور جس میں پاکستان کے اداروں کی تعمیرنو پر زور دیا گیا تھا۔ پاکستان کے بیرونی

تعلقات اور امریکی مفادات تجزیے کا فریم ورک تھے:

''2001ء میں نیویارک اور واشنگٹن پر دہشت گردوں کے حملے کے اڑھائی سال بعد پاکستان پر جو دباؤ تھا وہ مزید بڑھ گیا ہے۔امریکی فیصلے کا آغاز یہاں سے ہوا کہ اس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی مدد مانگی جس کی بنیاد امریکہ کے پالیسی اور علمی حلقوں میں پائی جانے والی یہ سوچ تھی کہ جنوبی ایشیا میں استحکام کے امکانات کے حوالے سے پاکستان کی حیثیت مرکزی ہے۔اس سٹڈی نے بھی یہی سوچ پیدا کی تھی۔ پاکستان کے اندرونی دباؤ کا ہر پہلو جس کا ہم نے تجزیہ کیا جیسے معاشی امکانات، فوج کا سیاسی کردار، اسلام اور عسکریت پسندوں کا کردار حتیٰ کہ ریاستوں اور خطوں کے درمیان کشیدگی وغیرہ، سب پاکستان کی سرحدوں سے باہر ہونے والی پیش رفتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔امریکہ کے بنیادی مفادات کے نکتہ نظر سے مثبت منظرنامے میں علاقائی استحکام، دہشت گردی کا خاتمہ، بھارت کے ساتھ تنازعہ کے کم خطرہ اور ایٹمی کنٹرول وغیرہ، ان سب کا تعلق ایک مستحکم پاکستان اور پاکستانی ریاست کی مضبوطی سے ہے۔اگر کوئی اس فہرست میں امریکہ کے معاشی مفادات اور توقعات کا بھی اضافہ کرتا ہے تو پاکستان کی بحالی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔''

سی ایس آئی ایس (CSIS) کی سٹڈی میں کہا گیا ہے کہ پاکستان پر کسی قسم کا اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لیے امریکہ کو اپنی توجہ اور وسائل جو وہ جنوبی ایشیا کے بالعموم اور پاکستان کے لیے بالخصوص رکھتا ہے اس میں اضافہ کرنا ہوگا اور اس بات کو اہمیت دینا ہوگی کہ امریکہ پاکستان میں کئی معروضات رکھتا ہے اور ان سب کو سنجیدگی سے لینا ہوگا۔ یہ پراجیکٹ اس سوچ کی بھی عکاسی کرتا ہے جو بائیڈن لوگر قانون سازی کے پیچھے تھے جس میں پاکستان کے لیے بڑھتی ہوئی فوجی امداد کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر معاشی امداد کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں پاک بھارت مذاکرات اور سول سوسائٹی کی اعانت پر بھی زور دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ پاکستان کو سماجی ترقی کی جس قدر شدید ضرورت ہے وہ تنہا حکومت پوری نہیں کرسکتی۔سب سے اہم یہ ہے کہ رپورٹ میں پاکستان کے سول اور حکومتی

اداروں کی کمزوری پر بھی بہت زور دیا گیا تھا اور یہ کہ امریکہ کی جانب سے اصلاحات اور امداد کا فوکس ان پر ہی ہونا چاہیے جس میں عدلیہ، تعلیم اور وہ ادارے خاص طور پر شامل ہیں جن کی ذمہ داری پاکستانی عوام کو بجلی اور پانی کی فراہمی ہے۔ منصوبے کے حصے کے طور پر ایک مشق کی گئی جس میں دو منظرناموں کو آزمایا گیا۔ ان میں سے ایک منظر نامہ یہ تھا کہ مشرف رفتہ رفتہ پاکستان کو بحال کردے گا اور دوسرا منظرنامہ یہ تھا کہ سیاسی بدامنی کے نتیجے میں مشرف کی حکومت ختم ہوجائے گی تاہم منحصر عنصر پاک بھارت تعلقات تھا، پاکستان کا مستقبل نہیں۔

2004ء میں شائع ہونے والی میری اپنی سٹڈی میں چوکنے انداز میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ پاکستان مختلف پہلوؤں کے ساتھ شاید ناقابل واپسی راستے پر پہنچ جائے اور یہ کہ انتہائی نوعیت کا اب کوئی منظر نامہ ایسا نہیں جو کہ ناقابل تصور ہو۔ میں نے اسٹیبلشمنٹ کے زیر غلبہ نظام کو بقاء کا ففٹی ففٹی چانس دیا تھا لیکن کوئی مخصوص وقت نہیں دیا تھا اور ساتھ ہی کچھ اشاریے بھی دیے تھے جو کہ 2006 تک سرخ سگنل دے رہے تھے۔ کتاب میں مشرف کے خاتمے اور ان مشکلات کی بھی پیش گوئی کی گئی تھی جو کہ اس کے بعد کی حکومت کو ہوسکتی تھیں۔

اس کے ساتھ ایک اسلامی بیانیہ بھی تھا جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان اسلامی انقلاب کا داعی ہوگا جو وہاں سے بھارت اور پھر ایسے ملکوں تک پھیل جائے گا جہاں کے مسلمان ظلم کا شکار ہیں۔ اس کی زبان 1970ء کی دہائی کے مارکسسٹوں کا عکس تھی جو کہ پاکستان کو اسلامی سوشلسٹ انقلاب کا دروازہ سمجھتے تھے۔ حسن عسکری رضوی لکھتے ہیں:

> ''طارق علی کی پاکستانی معاشرے کو اوپر سے لے کر نیچے تک تبدیل کی تجویز کی اسلامی آرتھوڈوکس اور نیوکنزرویٹوز کی جانب سے حمایت حاصل ہے جو کہ ایک اسلامی فریم ورک کے ساتھ ہے۔ وہ عسکریت پسندی کو معاشرے کو تبدیل کرنے اور اسلام دشمنوں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کا صفایا کرنے کا آلہ سمجھتے ہیں۔ ریاست اور معاشرے کو اسلامی خطوط پر تبدیل کرنے کے لیے ریاستی مشینری کو قبضے میں لینے کی باتیں انہی کی پیدا کردہ ہیں۔''

آرتھوڈوکس مارکسسٹ لیننسٹوں اور انتہا پسند اسلام پرستوں کے شخصی حکمرانی کے ویژن

میں مضبوط ہم شکلی پائی جاتی ہے۔بہت سے ملکوں میں ناراض دانشور طبقہ جو ماضی میں مارکس ازم کی جانب مائل ہوگیا تھا اب وہ بنیاد پرست اسلام میں دلچسپی رکھتا ہے۔

گذشتہ کئی سالوں کے دوران پاکستان کے بارے میں کی گئیں سنجیدہ سٹڈیز میں کسی میں ناکامی یا کامیابی کی بات نہیں کی گئی اور اکثر میں درمیانی قسم کے منظرنامے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔اکثر میں کچھ ایسے عوامل کی نشاندہی کی گئی تھی جو کہ فیصلہ کن ہوں گے۔ایک یورپی سٹڈی میں ریاستی یکجہتی کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔

برطانیہ میں مقیم ایک امریکہ تجزیہ کار جوناتھن پیرس نے جامع ترین پیش گوئیوں کی طرز کی سٹڈی تحریر کی جس کا عنوان ''پراسپیکٹس فار پاکستان'' تھا۔اس نے اپنی سٹڈی مکمل کرنے سے پہلے پاکستان کا دورہ نہیں کیا تھا تاہم اس کا تجزیہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔اس کا ٹائم فریم ایک سے تین سال کے درمیان تھا اور اس کی اپروچ پاکستان کو درپیش چیلنجز اور خصوصی اہمیت کے حامل دکھائی دینے والے ''موضوعات'' دونوں کا جائزہ لینا تھا۔ان میں آخرالذکر ان عوامل کے مساوی تھے جن کو اس پراجیکٹ میں شامل کیا گیا تھا۔جوناتھن پیرس نے جن چیلنجز کا ذکر کیا تھا ان میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی:

☆ ریاست میں ٹوٹ پھوٹ اور مختلف علاقوں پر سے اس کا کنٹرول ختم ہونے سے ملک کی سالمیت، یکجہتی اور استحکام متاثر ہوگا۔☆

☆ پاکستان بھر میں سکیورٹی اور دہشت گردی کے مسائل

☆ معیشت

☆ گورننس کے مسائل بشمول کرپشن

☆ پاکستان برانڈ کی تعمیرنو

اس فہرست میں شامل آخری آئٹم کا ذکر پاکستان کے سابق وزیرخزانہ اور وزیراعظم شوکت عزیز نے بھی کیا ہے اور یہ واضح نہیں کہ آیا اس کا مطلب بیرون ملک پاکستان کا امیج ہے یا پاکستانیوں کی ریاست سے وفاداری کی کوئی صورت اور پاکستان کا مقصد ہے جسے میں نے'' تصور پاکستان'' قرار دیا تھا۔

جوناتھن پیرس کی فہرست میں شامل موضوعات درج ذیل تھے:

☆ معیشت

☆ سول ملٹری ایشوز
☆ اسلام ازم کے رجحانات
☆ پشتون قوم پرستی کا مستقبل
☆ پاکستانی طالبان کا مستقبل
☆ پاکستان کے تین ملکوں بھارت، چین اور امریکہ سے تعلقات

دستاویزات کے اس پلندے میں آبادیات، بلوچستان میں بغاوت اور دیگر عوامل پر بھی بحث کی گئی تھی۔تاہم جو اہم چیزیں اس میں موجود نہیں تھیں ان میں میڈیا کے کردار، سول سوسائٹی کے ابھرنے ، عدالتوں کے نئے کردار اور آئینی پیش رفتوں پر بحث شامل ہے تاہم اس میں کچھ آئینی پیش رفتیں جیسے اٹھارویں ترمیم ایسی تھیں جن پر سٹڈی کے دوران ابھی کام جاری تھا۔

جوناتھن پیرس کی سٹڈی کا سب سے مفید ترین پہلو مرکزی موضوعات یا عوامل کے لیے مستقبل کے ان منظر ناموں پر کام تھا۔معیشت کے لیے اس نے ''گلاس آدھا بھرا ہے'' اور کچھ کم امید افزاء ''گلاس آدھا خالی ہے'' دونوں کی اصطلاح کا حامل منظر نامہ پیش کیا تھا۔سول ملٹری تعلقات کے حوالے سے بھی انہوں نے یہی اصطلاح استعمال کی تھی جبکہ تین طرح کے مستقبل پر بحث کی گئی تھی :فوجی غلبے کی واپسی، موجودہ سٹیٹس کو کا تسلسل اور ایک تیسرا منظرنامہ جمہوری کنسولی ڈیشن کی تحریک تھی۔اسلامی رجحانات کی بنیاد پر کم منظر نامے مرتب کیے گئے تھے تاہم اس نے پاکستانی سیاست میں غالب فیکٹر کے طور پر مذہبی جماعتوں کے ابھرنے یا طالبان کے قبضے کو خارج از امکان قرار دیا تھا۔

اپنی سمری جائزے میں جوناتھن پیرس کا کہنا تھا کہ پاکستان کے متوقع مستقبل کا جائزہ لیا جائے تو یہ افراتفری کی صورت حال والا ہوگا تاہم غیر متوقع چیلنجز اس بات کو بہت مشکل بناتے ہیں کہ اگلے ایک سے تین سال تک پاکستان کے بارے میں کوئی پیش گوئی کی جاسکے۔اس کا کہنا تھا کہ خوراک کی قیمتوں میں اضافے ، پاکستانی طالبان کے ابھرنے اور سوات وزیرستان میں پاکستانی فوج کے آپریشن اور ممبئی حملے سب ایسی باتیں ہیں جن کی پیش گوئی نہیں کی گئی تھی اور شاید ان کی پیش گوئی ممکن بھی نہیں تھی۔لہٰذا زیادہ امکان یہی ہے کہ پاکستان میں افراتفری کی صورت حال یا اس سے بھی بدتر کوئی حالت ہوسکتی ہے۔اگر کوئی

MashalBooks.org

غیرمتوقع بڑا سانحہ نہیں ہوتا تو پاکستان کے ناکام ریاست بننے کا کوئی امکان نہیں۔

اگلے ایک یا دو سال کے ٹائم فریم کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ قرین عقل ہے تاہم غیر یقینی کی حالتیں تاحال قابل غور ہیں۔''افراتفری کی صورت حال'' پاکستان کی امید افزاء خصوصیت کو بیان کرنے کے لیے ایک معیاری اصطلاح ہے اگرچہ ابھی اس کی وضاحت نہیں ہوئی اور ٹائم فریم بھی بہت مختصر مدتی ہے۔ ایک سینئر امریکی عہدیدار جس کے پاکستان بالخصوص فوج میں وسیع پیمانے پر تعلقات ہیں، کا کہنا ہے کہ اگر افراتفری کی صورت حال کی بات کی جائے تو پاکستان واٹر لائن سے نیچے ہوگا۔ پاکستان کی تاریخ اور سماج سے زیادہ آگاہی رکھنے والے مبصرین کی دیگر سٹڈیز میں کسی حد تک مختلف نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

جوناتھن پیرس کی سٹڈی کے فوری بعد بھارتی ماہرین کی ایک ٹیم جسے سرکاری فنڈ سے چلنے والے ادارے ڈیفنس سٹڈیز اینڈ اینالسز کی سپانسرشپ حاصل تھی، نے جو سٹڈی تیار کی اس میں بھی لگ بھگ یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا اور لگ بھگ نتائج بھی ایک جیسے تھے۔ حالیہ واقعات اور رجحانات پر ایک عمومی بحث کے بعد اس سٹڈی میں چھ بنیادی محرکات کی نشاندہی کی گئی جو اس سمت کا فیصلہ کریں گے جس میں کہ آنے والے وقت میں پاکستان جا سکتا ہے۔ ان میں سیاسی ڈائنامکس، پاکستانی معاشرے میں بنیاد پرستی، فوج، معیشت، بھارت کے ساتھ تعلقات اور خارجہ پالیسی شامل ہیں۔ ان سب کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے اور سب کو ہی بہت غیر یقینی بھی، تاہم ''محرکات'' کی اصطلاح سوال کی صورت میں ہے اور تجزیے میں چالیس سوال شامل ہیں۔ محرکات کو اہمیت کی اصطلاح میں شمار نہیں کیا گیا اور نہ ہی کچھ عوامل جیسے آبادیات وغیرہ کو سرے سے زیر غور لایا ہی نہیں گیا۔

اس سٹڈی میں تین منظر نامے تیار کیے گئے جن میں ''لبنانائزیشن''، ایک مستحکم پاکستان اور ایک تیزی سے زوال پذیر ریاست کے مبنی منظر نامے شامل ہیں۔ مصنفین نے بے بسی کے ساتھ تحریر کیا کہ اس میں کئی درمیانی منظر نامے بھی ہوں گے جن میں کچھ محرکات خارج ہو جائیں گے اور کچھ نہیں تاہم ان کی نہ تو فہرست بندی کی گئی اور نہ ہی ان پر بحث کی گئی۔ تجزیات کے آخر میں اس بیان کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ پاکستان کا استحکام اور جمہوریت ہی سب کے مفاد میں ہے تاہم بڑا سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان اپنے آپ کو ان مختلف رجحانات کے سامنے اکٹھا رکھ سکے گا جو اسے فی الوقت درپیش ہیں۔ چنانچہ پاکستان

کے دیگر ملکوں بالخصوص بھارت کے ساتھ تعلقات اس کے مستقبل کے حوالے سے حساس نہیں (سٹڈی نے دس سال کے ٹائم فریم میں دیکھا) تاہم اندرونی رجحانات اور پیش رفتیں خودمختار عوامل ہیں۔ہم رپورٹ کی پالیسی سفارشات کے بارے میں بعد میں بھارت کے بطور عامل کے ایک بحث میں بات کریں گے اور یہاں پر صرف اس بات کی نشاندہی کریں گے کہ رپورٹ کے مصنفین کے نکتہ نظر سے پاکستان کی جو حالت ہے اس میں بھارت بے قصور ہے اور یہ پاکستانی خرابیوں اور غلط اندازوں کا شکار ہے۔

آخر میں ایک منظرنامہ سازی سوچ پاکستان کے ایک ممتاز ترین ریٹائرڈ جنرل کی جانب سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کینیڈا میں2009ء میں ہونے والی کانفرنس میں پیش کی گئی۔وزارت دفاع میں سابق سیکریٹری اور اب ٹریک ٹو اور سیمینار سرکٹ کے سرگرم شریک کار لیفٹیننٹ جنرل(ر) طلعت مسعود نے تین منظر نامے پیش کیے۔ بہترین، بدترین اور جیسے تیسے (nuanced) ، تاہم اس میں کسی قسم کے امکانی تخمینہ جات پیش نہیں کیے گئے۔بہترین منظرنامے کے مطابق سویلین اور فوجی دونوں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کریں گے اور فرسودہ پالیسیوں کوختم کردیں گے۔ قانون کی حکمرانی بالخصوص سرحدی علاقے میں دوبارہ قائم ہوجائے گی اور فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی اور معاشی اصلاحات طاقت پکڑنے لگیں گی۔ بھارت سے تعلقات بہتر ہوں گے اور پاکستان ایک ترقی پسند ریاست کا اپنا پرانا رتبہ دوبارہ حاصل کرلے گا اور امریکہ، چین اور مسلم دنیا سے اچھے طریقے سے چلے گا۔

طلعت مسعود کے بدترین منظرنامے میں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ طالبان کا مسئلہ بڑھتا رہے گا۔ پاکستانی کے حامی عسکریت پسند کشمیر اور بھارت کے دیگر علاقوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں گے اور یوں پاکستان اور بھارت میں ایک اور بحران کی وجہ بنیں گے اور ان سیکورٹی مسائل کے نتیجے میں پاکستان کی جانب غیرملکی سرمایہ کاری رک جائے گی اور آخرکار ایک بار پھر فوج بغاوت کرکے اقتدار پر قبضہ کرلے گی۔

جیسے تیسے کا منظر نامہ یوں ہوگا کہ ملک میں اندرونی بدامنی جاری رہے گی تاہم بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے بھیجے جانے والے زرمبادلہ کی وجہ سے معیشت چلتی رہے گی۔عالمی معیشت پاکستان کی مدد کرتی رہے گی اور بھارت کے ساتھ مذاکرات بحال

ہو جائیں گے اور آئی ایس آئی اور فوج گریز کی پالیسی رکھیں گے۔

دیگر سٹڈیز

پیش گوئیوں کے حوالے سے دیگر کئی کوششیں اور پاکستان کی مستقبل کے حوالے سے بحث کی کوئی اہمیت نہیں۔

پاکستان کے ایک ممتاز ترین سکالر پرویز ہود بھائی نے ایک پانچ سالہ پراجیکشن پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور فوری طور اصلاحات نہ ہونے کی صورت میں نتائج سے خبردار کیا ہے۔ پاکستان کے بارے میں ایک سرکردہ سکالر اور انٹیلی جنس آفیسر بی رامن کا کہنا ہے کہ ایک اعتدال پسند پاکستان کی بقاء میں بھارت کے لیے سٹیک موجود ہیں۔ پاکستان کے دو لبرل صحافیوں نجم سیٹھی اور احمد رشید نے ایک ناکام پاکستان کے بارے میں اپنے تحفظات بیان کیے ہیں۔

برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی فرزانہ شیخ نے اس اس قسم کی اصطلاحات اور باتوں کو مسترد کیا ہے کہ پاکستان کنارے پر پہنچ چکا ہے یا ایک ناکام ریاست بن چکا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان کی مشکلات اس کے اندر سے برآمد ہوتی ہیں اور یہ کہ پاکستان کے شناخت کبھی واضح نہیں ہوسکی اور نہ ہی کبھی یہ اتفاق رائے پیدا ہوسکا کہ پاکستان کا مقصد کیا ہے۔ پاکستان کی معیشت کی ناکامی، سیاسی بدنظمی، علیحدگی، کرپشن اور دہشت گردوں کا اٹھ کھڑا ہونا سب مسائل جوناتھن پیرس کے خیال میں عوامل ہیں۔ تاہم اس کے تہہ میں جو کچھ چھپا ہے وہ ایک قومی مقصد کی غیر موجودگی بالخصوص اسلام کے حوالے سے دو پہلو اور فراخدلانہ کردار ہے جس نے اس کے قیام سے لیکر اب تک اس کی ترقی کو روک رکھا ہے۔ تاہم فرزانہ شیخ کسی حد تک امید رکھتی ہیں جس کی بنیاد ملک میں ابھرنے والا نیا میڈیا، متحرک عدلیہ اور قانونی برادری اور انسانی حقوق کے کارکن ہیں جو کہ پاکستان کو ایک نئے طریقے سے تصور کر رہے ہیں۔ جیسا کہ بینیڈکٹ اینڈرسن کہتے ہیں کہ قومیں ''تصور کردہ'' برادری ہوتی ہیں۔ انہیں دوبارہ تصور کیا جاسکتا ہے اور اس کی تہہ میں نظریات ہوتے ہیں۔ تاہم قوم کے طور پر پاکستان ایک ایسے پاکستان کے ساتھ ہم آہنگی سے نہیں چل سکتا جو کہ ریاست ہے اور نہ صرف یہ ایک ایسی قوم ہے جو گہری مشکل میں گھری ہے اور اپنے

قیام سے لیکر اب تک گھری ہوئی ہے۔ تاہم پاکستان کی ریاست بھی لرز رہی ہے اور سوال اٹھا رہی ہے کہ آیا ریاست نظریے کو سپورٹ کرسکتی ہے یا نظریہ ریاست کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

امریکہ کے ایک سابق انٹیلی جنس تجزیہ کار بروس رائیڈل جن کے پاکستان میں بہت پرانے تعلقات ہیں پیش گوئی نہیں لیکن قیاس کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی عسکریت پسند فتح حاصل کرلیں گے۔ وہ نشاندہی کرتے ہیں کہ پاکستان نے عسکریت پسندوں کو تخلیق کیا اور ان کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کے نتیجے میں اسلام آباد اسلامی گروپوں کے سامنے آسان شکار بن گیا۔ بروس رائیڈل کے مطابق اس بحران کا آغاز سوویت یونین کے خلاف جنگ اور پھر افغانستان پر قبضے سے ہوا تاہم گٹھ جوڑ اس سے بہت پہلے شروع ہوچکا تھا جس کے تحت ریاست کئی سالوں پہلے سے اسلامی عسکریت پسندوں کی پشت پناہی کررہی تھی۔ رائیڈل کے خیال میں پاکستان اب تبدیلی کے لئے تیار ہوچکا ہے لیکن یہ بنیادی تبدیلی بدترین بھی ہوسکتی ہے اور یہ کہ روح پاکستان کے لیے جنگ کبھی اس قدر شدید نہیں ہوئی۔ وہ ایک ایسا منظر نامہ تیار کرتا ہے جس میں اسلامی اور طالبان فورسز مشرق کی جانب طاقت پکڑ لیتی ہیں اور ''اسلامی امارات پاکستان'' قائم کرلیتی ہیں اور یوں عملی طور پر پاکستان کو اسلامی اور اعتدال پسند پاکستانیوں میں تقسیم کردیتی ہیں اور افغانستان کے پشتون علاقے میں اثر ورسوخ پھیلاتی ہیں۔ اس صورت میں پاکستان کے ایٹمی ہتھیار خطرے میں ہوں گے اور بھارت کے ساتھ تعلقات بدترین ہوجائیں گے اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کا بھی یہی حال ہوگا۔ بروس رائیڈل کی پالیسی سفارشات کے مطابق اس قسم کے مستقبل سے ہر حال میں بچنا ہے اور یہ کہ امریکہ کو پاکستان میں بچے کھچے اعتدال پسند عناصر کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔

بروس رائیڈل کا ''اسلامی امارات پاکستان'' ایک افسانوی نقشہ ہے۔ اس نے اس سلسلے میں کوئی ٹائم فریم نہیں دیا۔ تاہم پاکستان کے لیے ایمرجنسی اور اس کے مستقبل کے لیے تشویش کی جس گہرائی کی بات اس نے کی ہے اس میں کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں اور یہ فرض کرتا دکھائی دیتا ہے کہ امریکہ کے پاس اب بھی موقع ہے کہ وہ پاکستان کو خطرناک اور خودکو تباہ کرنے والے راستے سے ہٹالے جو اسے امریکہ کے اتحادی کے بجائے ایک بڑے دشمن میں تبدیل کردے گا۔

اسلام آباد میں کام کرنے والے ایک سابق امریکی سفارت کار جان آر شمٹ کا تجزیہ اور بھی مایوس کرنے والا ہے۔وہ پاکستان کی مشکلات کی جڑ اس کے جاگیردارانہ سیاسی کلچر کو قرار دیتے ہیں جس میں امیر لوگ ٹیکس دینے سے انکار کردیتے ہیں۔سیاسی پارٹیاں نظریات کے بجائے محض طاقت ور خاندانوں کے گرد گھومتی ہیں اوراس بات کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے کہ حکومت کس کی ہے۔پاکستان کے سیاسی اداروں میں بگاڑ بھی اسی طرح کا ہے۔اسلام پرستوں کے ابھرنے کے نتیجے میں ریاست کا اپنا وجود خطرے میں پڑ چکا ہے۔اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے افراتفری کی صورت حال کی تصدیق سری لنکن ٹیم پر دہشت گردوں کے حملوں جیسے واقعات سے ہوجاتی ہے۔وہ ممکنہ طور پر کسی قسم کی سنجیدہ اصلاحات میں مصروف نہیں دکھائی دیتے۔پاکستان کے بہت سے مسائل کا حل موجود ہے جن کے بارے میں شمٹ نے 2009ء میں لکھا تھا کہ اگر حکومت اسلام پرستوں کے خلاف کارروائی اور فوج طالبان کے خلاف کارروائی میں سنجیدہ ہوتو ابھی شاید اس قدر دیر نہیں ہوئی۔وہ خبر دار کرتے ہیں کہ حساب کا دن آ رہا ہے اور یہ کہ خرابی کو ختم کرنے میں جتنی تاخیر کی گئی اس میں خونریزی اور فساد بھی اتنا ہی بڑھ جائے گا۔اوریقینی طور پر پاکستان اسلام پرستوں کے نرغے میں چلا گیا تو یہ باقی دنیا کے لیے بہت ہلاکت خیز صورت حال ہوگی حالانکہ دیگر دنیا اس صورت حال کو روکنے میں بہت کم ہی کچھ کرسکتی ہے۔معاملہ ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح پاکستانی عوام اور اس پر حکمرانی کرنے والے سیاسی طبقات کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں ایک سابق پاکستانی پولیس افسر حسن عباس جو کہ اب امریکہ میں رہتے ہیں، جوناتھن پیرس کے ساتھ پاکستان کے ملٹی پل بحران کے بارے میں ایک جامع رپورٹ پیش کرتے ہیں جو کہ بروس رائیڈل اور دیگر کے مقابلے میں پاکستان میں مثبت تبدیلی کے حوالے سے امید افزا ہے۔ دہشت گردی، فرقہ وارانہ تشدد اور سیاسی اور فوجداری انتہا پسندی کے بارے میں تفصیلی سٹڈی سمیت ریاست کو لاحق حالیہ خطرات کے جامع جائزے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ وکلاء کی حالیہ تحریک اور نئے میڈیا کے ابھرنے کے بعد پاکستانیوں اور غیر پاکستانیوں کے لیے پاکستان کو مکمل طور پر ناکامی سے بچانے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔177 ملکوں میں دنیا کے نویں کمزور ترین ملک کے طور پر پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ عسکریت پسندی، کمزور حکمرانی اور معاشی عدم تحفظ جیسے مسائل ایک دوسرے سے باہم

منسلک ہیں او ر ایک خطرناک چکر کی صورت میں ایک دوسرے کا پیٹ بھر رہے ہیں اور پاکستان کو بچانے کے لیے اس چکر کو توڑنا ضروری ہے۔اسکے بعد سات سفارشات ہیں جو پاکستانی اور امریکی پالیسی سازوں دونوں کے لیے ہیں۔اول الذکر کے لیے جو سفارشات ہیں ان میں حکومت اور لوگوں کے درمیان ایک نئے سماجی معاہدے کی ضرورت، سامراجی دور کے قوانین کا خاتمہ، تعلیم اور صحت کے میدان میں زیادہ سرمایہ کاری، ریاستی اور حکومتی ڈھانچے کی ازسرنو تنظیم، صحت اور تعلیم کے اہداف حاصل کرنے کے لیے فوج کی ایجوکیشن اور میڈیکل کور کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت، ترقی پسند مذہبی گروپوں کو امداد کی فراہمی تاکہ طالبانائزیشن کے تصور کو شکست دی جاسکے، طالبان کی اطلاعاتی سٹرٹیجی کا خاتمہ، عسکریت پسند مدارس کو بند کرنا، پولیس، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انٹیلی جنس سروسز کی اوورہالنگ، بھارت کے ساتھ امن عمل کی بحالی اور تمام ایٹمی اسٹیبلشمنٹ پر سویلین نگرانی بڑھاتے ہوئے ایٹمی ہتھیاروں کی سکیورٹی میں اضافہ شامل ہے۔امریکہ کو بھی اسی قسم کا سفارشات پر مشتمل ایجنڈا دیا گیا جس میں پاکستان کے لیے جامع حکمت عملی اپنانے کی ضرورت، امداد کے لیے سخت شرائط سے گریز، مسئلہ کشمیر اور پاک بھارت تعلقات سے متعلق پالیسی سے نمٹنا، پاکستان کے بطور ایٹمی ریاست درجے کو تسلیم کرنا، امریکی امداد میں تعلیم اور صحت کے لیے زیادہ زور دینے کی ضرورت، قانون کے نفاذ میں سویلین قابلیت بڑھانے کی ضرورت، خیبرپختون خواہ میں ڈرون حملوں کے بجائے انسانی بنیادوں پر امداد کی تقسیم اور آخر میں پاکستان کو دی جانے والی امداد پر نگرانی بڑھانے کے موثر نظام کی ضرورت شامل ہے۔

حسن عباس کی سفارشات کا امکانی دائرہ بہت شاندار ہے اور اس میں یہ نکتہ شامل ہے کہ پاکستانی کی مکمل ٹرانسفارمیشن امریکہ کی بھرپور امداد کے ذریعے خود پاکستانیوں کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ان میں پاکستان کو درپیش شدید مشکلات اور اصلاحات کی فوری ضرورت کی عکاسی ہوتی ہے۔حسن عباس محتاط حد تک پرامید ہیں جبکہ اشاریے منفی ہیں اور جبکہ ''قیامت'' کے قابل بھروسہ منظرنامے بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سی چیزیں ٹھیک ہورہی ہیں جن 2008ء کے الیکشن کے بعد جمہوریت کی جانب بتدریج اور یقینی ٹرانزیشن خاص طور پر شامل ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ سیاست دان قدم جمارہے ہیں تاہم اگر وہ ڈیلیور کرنے میں ناکام رہے

تو فارغ ہوجائیں گے۔فوج کی طرف سے سیاست کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا مظاہرہ بھی اس قابل ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے تاہم سویلین اور جمہوری قیادت کو مکمل اختیار سنبھالنے اور مقامی اور خارجہ پالیسی کے امور میں فیصلہ کن پوزیشن لینے میں ابھی وقت لگے گا۔ان کے نزدیک پاکستان میں امید کی جو دو کرنیں ہیں وہ 2007-2009ء میں بپا ہونے والی وکلاء تحریک اور نئے میڈیا کا ظہور ہے۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہا گیا کہ ایسی صورت میں پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا کہ اگر اصلاحات کے مذکورہ بالا پروگرام کا آغاز نہیں کیا جاتا اور اسے کامیابی کے ساتھ آگے نہیں بڑھایا جاتا۔حسن عباس ناکامی کی شکل اور نظام الاوقات کو زیرِ غور نہیں لائے۔

MashalBooks.org

حواشی

1۔ امریکی انٹیلی جنس کونسل کی رپورٹ: گلوبل ٹرینڈز2025: اے ٹرانسفارمڈ ورلڈ
2۔ سٹیفن کوہن، دی آئیڈیا آف پاکستان
3۔ جن چند لوگوں نے جناح کے تصور پاکستان کا جواز پیش کیا ان میں قدامت پرست ہندوستانی سیاست دان جسونت سنگھ بھی شامل ہیں جنہیں اس کی پاداش میں بی جے پی سے نکال دیا گیا۔
4۔ جنرل کے ایم عارف کی کتاب: اسٹرینجڈ نیبرز، انڈیا پاکستان 1947-2010
5۔ ناروے کے سکالر ڈیوڈ ہینسن کی مثال سب کے سامنے ہے جسے پاکستان کے بارے میں تحقیق کی پاداش میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں حقیقی ریسرچ کس قدر مشکل ہے۔
6۔ دیکھیے، الحان نیاز کی کتاب، دی کلچر آف پاور اینڈ گورننس آف پاکستان 1947-2008 (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان)
7۔ اس اقدام کے موقع پر سرگرم ایک سینئر ریٹائرڈ پاکستانی افسر کے ساتھ بات چیت کی بنیاد پر تیار ہونے والی رپورٹ، دیکھیے عزیز حنیفہ؛ ''مشرف کبھی بھی مسئلہ کشمیر کے حل کے قریب نہیں پہنچے۔'' انڈیا ابراڈ سولہ دسمبر 2010ء
8۔ لال مسجد پر حملے سے ملتا جلتا واقعہ بھارتی فوج کی جانب سے 1984ء میں سکھوں کے مقدس گردوارے گولڈن ٹیمپل پر ہونے والا حملہ تھا۔ اس کے نتیجے میں بھارتی فوج، پولیس اور سکھ عسکریت پسندوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی جس میں آخرالذکر فریق کو عام سکھ لوگوں کی مدد بھی حاصل تھی جو گولڈن ٹیمپل پر حملے کے خلاف سخت غصے میں تھے۔ اسی واقعے کے نتیجے میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی اپنے سکھ باڈی گارڈ

MashalBooks.org

کے ہاتھوں قتل کر دی گئی تھیں۔ اسلامی عسکریت پسندوں نے قتل کرنے کی کئی کوششیں کیں جن میں فوج کے کئی افسر جاں بحق ہو گئے۔

9۔ عامر میر کی رپورٹ 2010ء میں خودکش حملوں میں 35 فیصد کمی ہوئی۔ دی نیوز، دسمبر 2010ء

10۔ دیکھیے بی رامن، ''کیا پاکستان کو ختم ہونے دینا کوئی آپشن ہے۔'' یوریشیا ریویو دسمبر 2010ء

11۔ احمد فاروقی، ''ریورسنگ ہسٹری'' فروری 2010ء آؤٹ لک، انڈیا

12۔ پاک بھارت مذاکرات کی ناکامی کے تناظر میں امید کے بارے میں ایک بصیرت افروز مضمون کے لیے دیکھیے، مہرین زہرا ملک ''ہوپ اینڈ اٹس ڈس کونٹینٹس''، دی فرائیڈے ٹائمز، جولائی 2010ء

13۔ سانحات اور غیر متوقع واقعات کی جدید سٹڈیز کے لیے دیکھیے، لی کلارک، ورسٹ کیس : ٹیرر اینڈ کٹاسٹروف ان دی پاپولر ایمیجی نیشن (شکاگو، یونیورسٹی آف شکاگو پریس 2006)

14۔ برٹش کونسل، '' پاکستان : دی نیکسٹ جنریشن'' نومبر 2009ء

15۔ اطہر اسامہ، ''ایچ ای سی سکالرز : ول دے ریٹرن اینڈ سٹے ؟'' پاکستانی ریسرچ سپورٹ نیٹ ورک، اگست 2008ء

16۔ قزلباش کے خیالات ووڈ رو ولسن سنٹر میں 7 اپریل 2010 ہونے والی کانفرنس میں سامنے آئے۔

17۔ ولی ناصر، فورسز آف فارچون :دی رائز آف دی نیو مسلم مڈل کلاس اینڈ وٹ اٹ ول مینز فار آر ورلڈ، نیویارک فری پریس 2009

18۔ جوناتھن پیرس، پراسپیکٹ فار پاکستان

19۔ ایک وقت تھا کہ پاکستان کی فی کس آمدنی اپنے سے کئی گنا بڑے ملک بھارت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ آج بھارت چین اور برازیل کے ساتھ اپنی آٹھ فیصد کی شرح نمو کے ساتھ دنیا میں تیز ترین ترقی والی معیشت ہے۔

20۔ اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ، پاکستان کے لیے منتخب کنٹری ڈیٹا اور تخمینہ

جات (1986-2013)

21۔ دیکھیے ایڈٹو پاکستان بائی دانمبرز، سنٹر فار گلوبل ڈویلپمنٹ

22۔ زیشان حیدر، ''ملٹری ہٹ پاکستان اپس ڈیفنس سپینڈنگ بائی 17 پرسنٹ'' رائٹرز، جون 2010

23۔ دیکھیے، سٹیفن کوہن کی ''آئیڈیا آف پاکستان'' اور فرزانہ شیخ کی ''میکنگ سینس فار پاکستان'' (نیویارک، کولمبیا یونیورسٹی پریس،2009ء)

24۔ پاکستان میں نسلوں کے شاندار جائزے کے لیے دیکھیے، الیسا آئرس کی کتاب، سپیکنگ لائیک اے سٹیٹ، لینگویج اینڈ نیشنل ازم ان پاکستان (کیمبرج، یوکے، کیمرج یونیورسٹی پریس،2009)

25۔ محمد مشتاق اور سید خواجہ علقمہ ''پاورٹی ایلیویشن تھرو پاور شیرنگ ان پاکستان''، یورپین جرنل آف سوشل سٹڈیز (2009)

26۔ پراوین سوامی، انڈیا، پاکستان اینڈ سیکرٹ جہاد (لندن، روٹلج،2007)، رضوان حسین، پاکستان اینڈ دی ایمرجنس آف اسلامک ملیٹینسی ان افغانستان (برلنگٹن، ایش گیٹ 2005)، بارنیٹ روبن، دی فریگمین ٹیشن آف افغانستان (نیو ہیون، ییل یونیورسٹی پریس، 2002)، مریم ابو ذہب ''دی ریجنل ڈائمینشن آف سیکٹرین کونفلکٹس ان پاکستان'' اور دیگر کتب اور مضامین

27۔ بدترین منظرنامے کے لیے دیکھیے پرویز ہود بھائی، ''وائیدر پاکستان''

28۔ خاص طور پر عاقل شاہ، حسن عسکری رضوی اور شوکت قادر، لیکن لگ بھگ ہر پیپر میں کسی نہ کسی طریقے سے فوج پر خیال آرائی کی گئی۔

29۔ دیکھیے غیر ضروری طور پر توہین آمیز بلاگ ''لینڈ آف امپیور'' جو بین یان کی جانب سے پوسٹ کیا گیا۔

30۔ کوہن، دی پاکستان آرمی (برکلے، یونیورسٹی آف دی کیلی فورنیا پریس1985)

31۔ پاکستانی فوج کی آفیسر کور بنیاد پرست اسلامی فکر کا ہاٹ بیڈ نہیں۔تاہم یہ اسلامی جنگی نظریات کے ساتھ انگیج رہتی ہے اور اس سلسلے میں اسلامی اصولوں سے رہنمائی کی تلاش میں رہتی ہے۔ دیکھیے سٹیفن پی کوہن ، دی پاکستان آرمی (برکلے، یونیورسٹی

MashalBooks.org

آف کیلی فورنیا پریس)۔ پرعزم آفیسر مغربی پیشہ ورانہ ماڈل کو اختیار کرتے ہیں اور ان میں سے کئی فوج کی جانب سے بنیاد پرستوں سے ہاتھ کھینچنے پر تحفظات رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی تھیالوجی عملیت پسندی پر مبنی ہے تاہم وہ فوج کے اندر اور باہر حقیقی انتہا پسندی سے نمٹنے کے لیے کوئی سٹریٹجی تلاش نہیں کر سکے کہ وہ لبرل اور سوشل نظریات پر بھی اعتماد نہیں کرتے۔

32۔ ریاستی گورننس کی اہمیت کے حوالے سے ایک ہم عصر یورپی سٹڈی کے لیے دیکھیے، مارکو میزیرا، چیلنجز آف پاکستان ز گورننس سسٹم، (2009)

33۔ رائے عامہ پر جمعہ کے خطبات اور مساجد کے اثر کے حوالے سے اقدامات تو بہت دور کی بات سٹڈی کے لیے بھی بہت کم کوششیں کی گئیں۔ اسکی معمولی سی جھلک دیکھنے کے لیے مشعل گروپ کے طالب علموں اور مبصرین کی جانب سے کی جانیوالی سٹڈیز کا مطالعہ کیجیے جو کہ پرویز ہود بھائی کی جانب سے قائم کردہ لبرل پبلی کیشن اور ری پرنٹ کا ایک ادارہ ہے۔ دیکھیے، میسج فرام دی ماسق، یہ مساجد کے خطبات کا ایک جائزہ ہے جسے http://imams.mashalbooks.org پر دیکھا جاسکتا ہے۔

34۔ اس بات کا شاید کبھی پتہ نہ چل سکے کہ یہ ریاست کی نااہلی تھی یا بدنیتی جس کے نتیجے میں بےنظیر کی سیکیورٹی کے حوالے سے غفلت برتی گئی۔ انہوں نے اپنے اس یقین سے معاملے کو خراب کیا کہ پاکستان کے لوگ، ان معلوم عناصر کے خلاف کہ جو انہیں مردہ دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی حفاظت کریں گے۔

35۔ رابرٹ بلیک ویل، ''پلان بی ان افغانستان، وائے ایک ڈی فیکٹو پارٹیشن از دی لیسٹ بیڈ آپشن''، فارن افیئر ز 2011

36۔ پامیلا کانسٹیبل، ''پاکستان ز آرمی چیف سیکز سٹیبل افغانستان''، واشنگٹن پوسٹ فروری 2011

MashalBooks.org

MashalBooks.org